عکسِ حیات

مرتبہ:
اطہر ضیاء مشتاق
جنرل سیکرٹری

ینگ مین حسین پوری ایسوسی ایشن

عکسِ حیات

بیاد پروفیسر عبدالمحصی (مرحوم)

صد سالہ پیدائش 1909ء تا 2009ء

مرتبہ:
اطہر ضیاء مشتاق
جنرل سیکرٹری

ینگ مین حسین پوری ایسوسی ایشن

انتساب

خاندان حسین پور کے اُن تمام بزرگوں کے نام جنہیں پروفیسر عبدالمحصی "مرحوم "کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا اور اُنہوں نے اپنے خون سے ایسوسی ایشن کی آبیاری کی

فہرست

☆ اظہار تشکر	اطہر ضیاء مشتاق
☆ پیش لفظ	فضاء احمد مشتاق
☆ خراج تحسین (منظوم)	اطہر ضیاء مشتاق
☆ ایک تاثر	لئیق احمد قریشی
☆ بھائی عبدالمحصی (مرحوم)	فضاء احمد مشتاق
☆ اقتباس	شیدا احمد مشتاق
☆ اقتباس بیاد پروفیسر عبدالمحصی (مرحوم)	ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی
☆ ہدیۂ تبریک	انعام احمد صدیقی
☆ بھائی عبدالمحصی (مرحوم) کی شخصیت	رضا احمد مشتاق
☆ پیغام	سکندر عالم
☆ پیغام تہنیت	نواز الحق
☆ میرے بھائی۔ میرے اُستاد	بہار احمد مشتاق
☆ اقتباس	اظہر حسن لطیف
☆ ایک یاد	محمد احمد غزالی
☆ نذر خلوص	جاوید ارشد مشتاق
☆ میرے ابا جان	شاہد اطہر
☆ لمحہ مسرّت	مغیث احمد صمدانی
☆ صدائے دل	فرخ ضیاء مشتاق
☆ تاریخی خطبہ صدارت	پروفیسر عبدالمحصی (مرحوم)
☆ شہر بہاولپور کی تاریخ کا مختصر جائزہ	اطہر ضیاء مشتاق

اظہارِ تشکر

میں اس کتاب ''عکسِ حیات'' کی جستجو میں برسوں سے تھا۔ یہ خواہش تھی کہ بانی ایسوسی ایشن حضرت عبدالمحصیؒ کی یادوں اور باتوں کو جتنا جلد ہو کتابی شکل میں شائع کروں کیونکہ میں بھی خاندان کے اُن افراد میں شامل ہوں جنہوں نے اپنی آنکھ سے موصوف کو دیکھا نہیں لیکن خاندان کے بزرگوں کی بدولت دل کی آنکھ سے اُنہیں پہچانا۔ اُن کی فراست، اُن کے دینی اور دنیاوی علوم پر دسترس، اُن کی شخصیت اور اُن کا سب سے بڑا احسان جو اُنہوں نے خاندان حسین پور پر کیا وہ ینگ مین حسین پوری ایسوسی ایشن کا قیام ہے۔

میں تو سمجھتا رہا کہ میں یہ کام کرلوں گا اور وہی جذبہ کام آیا کہ یہ کتاب آج آپ کے ہاتھوں کی زینت ہے۔ مجھے اپنی کم مائیگی کا احساس ہے لیکن میں نے اس بات کو ملحوظِ خاطر رکھا کہ اس کتاب میں کوئی کمی نہ رہے میں جو اپنے اوپر قرض اور فرض سمجھتا ہوں وہ پورا ہو جائے اور نسلِ نو کی رہنمائی ہو سکے۔

معزز قارئین! جس وقت ینگ مین حسین پوری ایسوسی ایشن کا 24واں اجلاس عام بہاولپور میں منعقد کرنے کا فیصلہ کیا گیا اور یہ بھی طے پایا کہ بانی ایسوسی ایشن جناب پروفیسر عبدالمحصیؒ کی صد سالہ یومِ پیدائش کی تقریب بھی منعقد کی جائے گی۔ میں نے تجویز دی کہ ایک مرصّع کتاب بھی شائع کی جائے جس میں جناب عبدالمحصی (مرحوم) کے حالاتِ زندگی، اُن کی خاندانِ حسین پور کے لئے خدمات، ینگ مین حسین پوری ایسوسی ایشن کا قیام اور اُن کی شخصیت کے پہلوؤں کو اُجاگر کیا جائے تاکہ نسلِ نو اپنے بزرگوں کے احوال، اُن کی بردباری اور خاندان کے لئے ایثار، اُن کے دینی اور دنیاوی علم کے بارے میں جان سکے۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی طے پا گیا کہ اس کتاب میں سرزمینِ بہاولپور کی مختصر تاریخ بھی شامل کی جائے۔ لہٰذا میں نے تجویز دی تو یہ ذمہ داری بھی مجھے قبول کرنی پڑی۔ شوق شوق میں کچھ تاریخ کے حوالے سے کتب اور پھر انٹرنیٹ سے معلومات جمع کیں جن میں ''سرزمینِ بہاولپور۔ ڈاکٹر سید زاہد علی واسطی''، ''مختصر تاریخ بہاولپور۔ شیخ انور نبی''، ''اولیائے بہاولپور۔ مصور حسن شہاب'' اور انٹرنیٹ کا بھی سہارا لیا۔

میرے لئے ناممکن تھا کہ جو کتب حاصل ہوئی ہیں اُنہیں پہلے پڑھوں اور پھر مختصر تاریخ تحریر کروں۔ میں

گو چھُپ گیا ہے چاند مگر اُس کے نور سے
یہ انجمن ہے آج بھی تاباں اُسی طرح
وہ شمع بُجھ گئی مگر اُس کے فروغ سے
قندیلِ آرزو ہے فروزاں اُسی طرح

بہارؔ احمد مشتاق

ایم۔اے انگلش اور ایم۔اے ہسٹری کیا تھا۔ میں یہ دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ خاندان میں انگلش لٹریچر کے پہلے ایم۔اے تھے۔ میں نے بطور استاد کے انہیں بہترین استاد پایا۔ یہ سکول کے پسندیدہ استادوں میں سے تھے۔ شرارتی سے شرارتی لڑکا بھی ان کا ادب کرتا، نہ صرف اپنے پڑھائی کے مسئلے مسائل پر ان سے تبادلہ خیال کرتا بلکہ اپنے ذاتی مسائل بھی انہی سے حل کرواتا۔ اس زمانے میں مار پیٹ کا بہت رواج تھا۔ دوسرے استاد جو مار پیٹ سے کام نہیں لے سکتے تھے یہ معمولی ڈانٹ ڈپٹ سے کام نکال لیا کرتے تھے۔ بس ایک لمبی سی اوہ کہہ کر اور آنکھیں دکھا کر لڑکوں کو سہما دیتے تھے۔ میں نے سُنا ہے کہ یہی حال اُن کا کالج میں تھا۔ وہاں بھی طلباء بہت عزت سے پیش آتے تھے اور کبھی بدتمیزی کرنے کی جرت نہیں کرتے تھے۔

بہاولپور کی تاریخ کے سلسلہ میں یہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ چولستان اور یہاں کے تاریخی قلعے پر معلوماتی مضمون جو آپ پڑھیں گے وہ آپ کی دلچسپی کا باعث ہوگا۔

تقسیمِ ہند کے موقع پر ۱۹۴۷ء میں ہندو مسلم فسادات پھوٹ پڑے جس کی وجہ سے ممبران ایسوسی ایشن ہندوستان کے مختلف شہروں سے لُٹ پٹ کر پاکستان پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس وقت انہیں ہمدردی اور مالی امداد کی ضرورت تھی لیکن صدر ایسوسی ایشن جناب عبدالمجید دہلی میں مقیم تھے۔ وہ ممبران کی مدد کرنا چاہتے تھے لیکن ذرائع مواصلات نہ ہونے کی وجہ سے کسی قسم کی مدد نہیں کر سکے۔ کچھ ممبران سیدھے بابیوالہ پہنچ گئے۔ ان کی امداد حسبِ توفیق یہاں کے لوگوں نے کی۔ ایسوسی ایشن کے خازن بھی بابیوالہ میں موجود تھے۔ ایسوسی ایشن کا پیسہ بغیر صدر کی اجازت کے خرچ کرنے کا حق نہیں تھا لیکن انہوں نے تمام پیسہ باہر سے آئے ہوئے ممبران پر خرچ کر ڈالا۔ بعد میں صدر صاحب سے اجازت بھی لے لی۔ لیکن یہ جمع پونجی اتنی تھوڑی تھی کہ ممبران کی ضروریات کو پورا نہیں کر سکتی تھی۔ جس کی وجہ سے بعض ممبران ناراض بھی ہو گئے اور اسی بنیاد پر ایسوسی ایشن سے علیحدگی اختیار کر لی۔ صدر صاحب ۱۹۴۸ء میں پاکستان پہنچے تو انہوں نے اُسی سال پہلی فرصت میں اجلاس عام کراچی میں طلب کیا جہاں آپ کی ایک آواز پر مختلف

خراجِ تحسین

چھا گئی دل پر اُداسی آنکھ پُرنم ہو گئی
زندگی آئینہ دارِ صورتِ غم ہو گئی
ضو چراغِ آرزو کی خود بخود کم ہو گئی
بزم کی رنگیں نوائی وقفِ ماتم ہو گئی
لے کے اپنے ساتھ اہلِ دل کا ہنگامہ گئے
انجمن کو چھوڑ کر اِک انجمن آرا گئے

اُن کا قلب مضطرب تھا مسکنِ سوزو گداز
غم زدہ کے ہمنوا،افسردہ دل کے دلنواز
ناز کے عالم میں رہتے تھے وہ پابندِ نیاز
مشکلات روزو شب میں ہر کسی کے کارساز
کیا بیاں ہو سادگی بھی اُنکی تھی کس شان کی
اُن میں ہر خوبی عیاں تھی اِک شریف انسان کی

گو خطابت میں اُنہیں حاصل تھا اِک عالی مقام
معترف ہے اُن کے حسنِ فن کا ہر اِک خاص و عام
حرف کی تاثیر دے گی اُن کی شہرت کو دوام
دل کو گرماتا رہے گا تا ابد اب اُن کا نام
اُن کا اک اک حرف ہے آئینہ سوزِ دروں
اُن کے اک اک لفظ میں شامل رہا ہے دل کا خون

ایک تاثر

لئیق احمد قریشی، بہاولپور

ہم لوگ دنیا کی معلومات رکھتے ہیں۔ زمین اور آسمان کا علم حاصل کرتے ہیں۔ مگر بہت کم لوگ یہ بتا سکتے ہیں کہ وہ کس خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ اُن کے آباؤ اجداد کے کیا نام ہیں، اُن کے مشاغل اور کار ہائے نمایاں کیا رہے۔ تمام افرادِ خاندان کو بالعموم اور آنے والی نسلوں کو بالخصوص یہ معلوم ہو سکے کہ وہ کس پاکیزہ خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ اُن کو بھی صاحبِ علم ہونے کی ضرورت ہے جس کی بدولت ہی خاندانی وقار ہمیشہ روشن دکھائی دے سکتا ہے۔ ہم سے نزدیک تر خاندان کے وہ لوگ ہیں جنہوں نے تقویٰ کی اہمیت کو کبھی نظر انداز نہیں کیا اور وہی ہمارے لئے مشعلِ راہ ہیں۔ وہی شخصیات خاندانِ حسین پور میں نمایاں بھی ہیں۔ ہمارے خاندان کے تمام بزرگ باعثِ احترام ہیں اور آئندہ نسلوں کے لئے قابلِ احترام بھی ہیں۔ انہی باتوں کو سامنے رکھتے ہوئے ہمارے بھائی پروفیسر عبدالمحصیؒ نے ینگ مین حسین پوری ایسوسی ایشن کی بنیاد رکھی تا کہ خاندانِ حسین پور کے وقار کو تعلیم کے ذریعے روشن اور منوّر رکھا جا سکے۔

جہاں تک میرے بھائی محصی سے تعلق کی بات ہے تو یہ عرض کرتا چلوں کہ میرا اور بھائی محصی صاحب کا بہاولپور کے رہائشی ہونے کے ناطے کچھ عرصہ ساتھ رہا۔ آج جب مجھے موصوف کے بارے میں خیالات تحریر کرنے کی دعوت ملی تو میں حیران تھا کہ کیا لکھوں اور کیا چھوڑ دوں۔ محصی صاحب جیسی شخصیت کے بارے میں لکھنے بیٹھا تو کبھی جذبات غالب آئے اور کبھی الفاظ ساتھ چھوڑ گئے۔ لیکن میں وعدہ کر چُکا تھا لہٰذا چند باتیں جو میرے سامنے آئیں اُنہیں تحریر کر دیا۔

پروفیسر محصی صاحب کا شمار نیک لوگوں میں ہوتا ہے۔ اور اس کی دلیل یہ ہے کہ آپ کے لئے زندگی میں

بھائی عبدالمحصی صاحب (مرحوم)

فضا احمد مشتاق، کراچی

ینگ مین حسین پوری ایسوسی ایشن کے موجودہ جنرل سیکریٹری عزیز اطہر ضیاء مشتاق نے بتایا کہ اس مرتبہ ایسوسی ایشن کا اجلاسِ عام بہاولپور میں بُلانے کا ارادہ ہے۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ بہاولپور کی تاریخ اور وہاں کے رہنے والے بزرگ ممبر جناب عبدالمحصی (مرحوم) کی صد سالہ سالگرہ پر ایک ایسا ہی کتابچہ شائع کروں جیسا اجلاسِ عام کے موقع پر بابیوالہ کی تاریخ اور وہاں کے بزرگان پر کیا تھا۔ اس لیے میرے ذمے انہوں نے عبدالمحصی صاحب کی نجی زندگی کے متعلق کچھ لکھ کر دینے پر نہ صرف زور دیا بلکہ اصرار بھی کیا۔ اس لیے مجھے وعدہ کرنا پڑا۔ وعدہ کرنا آسان ہے لیکن نبھانا بہت مشکل ہے۔ سوچتا ہوں کہاں سے شروع کروں اور ان کی نجی زندگی کے کن کن پہلوؤں پر روشنی ڈالوں۔ ہر انسان کی زندگی میں مختلف ادوار کے ساتھ ساتھ نئی نئی تبدیلیاں آتی رہتی ہیں مثلاً لباس ہی کو لے لیں اگر کوئی شخص آج قمیص پاجامے میں ملبوس ہے تو کل کو کرتا شلوار میں نظر آتا ہے اور پرسوں سُوٹ پہنے پھر رہا ہوتا ہے، لیکن بھائی محصی کے ساتھ ایسا نہیں تھا۔ اُن کا ایک ہی لباس تھا، گرمیاں ہوں، سردیاں ہوں یا برسات ہو۔ قمیص پاجامے اور شیروانی، سردیوں میں گرم اور گرمیوں میں ٹھنڈی شیروانی۔ شیروانی کا کپڑا البتہ بہت بڑھیا اور مہنگا ہوتا تھا۔ بوٹ پہنتے تھے لیکن کڈ کا براؤن چمڑے کا۔ اس زمانے میں بھی بہت مہنگا ہوتا تھا۔ اب تو تلاش کے باوجود کڈ کے چمڑے کا بوٹ ملنا بہت دُشوار ہے۔

گورنمنٹ یا کسی کمپنی کے دفتر میں ملازمت نہیں کی۔ شروع ہی سے تدریس کے پیشے سے ایسے منسلک ہوئے کہ بس اسی کے ہو رہے۔ سکول میں ماسٹری بھی کی۔ کالج میں پروفیسری بھی کی لیکن لباس وہی رہا یعنی قمیص پاجامہ اور شیروانی۔ گھر میں بھی یہی ڈریس رہا۔ بوٹ کے بجائے البتہ کانپوری چپل بڑھیا والے

منسٹری آف ایجوکیشن نے انگریزی کی چند کتابیں اردو میں ترجمہ کرانے کے لیے مختلف اداروں اور کالجز میں بھجوائیں اور کہا کہ اگر کوئی صاحب اس مقابلے میں حصہ لینا چاہیں تو فلاں کتاب کا فلاں چیپٹر ترجمہ کر کے بھیج دیں۔ اگر ترجمہ پسند آ گیا تو وہ کتاب انہیں کو ترجمہ کرنے کے لئے دے دی جائے گی اور انعام بھی دیا جائے گا۔ مشکل کتابوں کا انعام بھی زیادہ تھا۔ ان میں فلسفے کی سب سے زیادہ مشکل کتاب جس کا انعام بھی سب سے زیادہ تھا، بھائی صاحب نے پسند کی اور ترجمہ کر کے بھیج دیا۔ وہ ترجمہ پسند کیا گیا اس طرح وہ کتاب اُنہیں کو ترجمے کے لئے دے دی گئی۔ وہ کتاب انہیں کے نام سے شائع ہوئی۔ مطلب یہ کہ محصی صاحب نہ صرف انگریزی کے ماہر تھے بلکہ اردو کے بھی اتنے ہی ماہر تھے۔

کالج کے زمانے کا ذکر ہے کہ ان سے کہا گیا کہ کالج کی پروفیسری قائم رکھنے کے لئے پبلک سروس کمیشن کا امتحان پاس کرنا ضروری ہے اس لیے آپ فلاں تاریخ کو کراچی میں فلاں جگہ کمیشن کے سامنے پیش ہوں۔ انہوں نے جب یہ سُنا تو پریشان ہونا شروع ہو گئے۔ نوکری کی تو انہیں فکر نہیں تھی جتنا اس بات کا خوف تھا کہ اگر انہوں نے فیل کر دیا تو کالج میں میری کیا عزت رہ جائے گی۔ مقررہ تاریخ سے چند روز قبل وہ کراچی آ گئے۔ میں نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح ان کا خوف دور ہو جائے لیکن جوں جوں وقت قریب آتا گیا اُن کی پریشانی اور خوف میں اضافہ ہوتا گیا۔ مقررہ دن پر میں بھی اُن کے ساتھ گیا۔ آخر کار انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں اور یہ کمیشن کے سامنے انٹرویو کے لئے کمرے میں داخل ہو گئے۔ بھائی صاحب خود بتاتے ہیں کہ انہیں بہت عزت سے بٹھایا گیا۔ انٹرویو لینے والوں میں اتفاق سے ان کا شاگرد بھی تھا۔ اس نے اپنا تعارف کرایا اور اپنے دوسرے ممبران سے ان کی قابلیت کی بہت تعریف کی۔ انہیں بتایا کہ یہ میرے استاد رہ چکے ہیں، آپ نے کچھ سوالات کرنے ہوں تو بلا تکلف کریں لیکن سب نے کہا کہ ان سے ہم کیا سوالات کریں گے، ہمیں ڈر ہے کہ یہی نہ ہم سے سوال کر بیٹھیں۔ اس طرح ان کا یہ مرحلہ طے ہوا۔

۱۹۴۸ء میں پہلی فُرصت میں شہر کراچی میں اجلاس عام بلایا گیا۔ اس موقعے پر جو خطبۂ صدارت پڑھا گیا وہ بہت سراہا گیا۔ لکھا بھی بہت محنت سے گیا تھا۔ اُسے اردو زبان کے ادب کا ایک ٹکڑا کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ میرا ارادہ یہاں ایسوسی ایشن کے کارنامے گنوانے کا نہیں ہے اس کے لئے تو ایسوسی ایشن کا ریکارڈ محفوظ ہے پڑھا جاسکتا ہے۔

اپنے بچوں سے ہر باپ کی طرح بہت محبت کرتے تھے لیکن بچوں پر ان کا بڑا رعب تھا۔ میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ وہ کسی بچے کو گود میں اٹھا کر بہلا رہے ہوں لیکن ان کی ہر آسائش کا خیال رکھتے تھے۔ سال میں ایک دو مرتبہ عید بقرعید پر بچوں کو بازار لے جا کر ان کی مرضی کے کپڑے اور جوتے ضرور دلاتے تھے جس سے بچے خوش ہو جاتے تھے۔ بچوں کو خود بھی پڑھاتے تھے۔ ان کے پڑھانے کا انتظام بھی کرتے تھے۔ اسی لیے ان کے بچے ماشاءاللہ سب ایم اے، ایم بی اے، انجینئر ہیں۔ سب بچے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں اور آسودہ زندگی گزار رہے ہیں۔

اپنی صحت کی طرف سے ہمیشہ لاپرواہ رہے۔ دل کے تو کمزور ہمیشہ ہی سے تھے۔ کبھی کبھی حکیم برق سے، جو ان کے دوستوں میں سے تھے، علاج کرا لیتے تھے۔ حکیم برق دلی کے مشہور حکماء میں سے تھے۔ نباض بہت غضب کے تھے، علاج بھی کرتے تھے لیکن ان کے علاج سے کم ہی لوگ صحت یاب ہوتے تھے۔ یہ خود بھائی صاحب کا کہنا تھا۔ ناشتے میں ہمیشہ دودھ کی بالائی استعمال کرتے۔ سُنا ہے ڈاکٹر صاحبان چالیس سال کے بعد بالائی کا استعمال ممنوع قرار دیتے ہیں۔ پچاس پچپن سال کے بعد تو اسے زہر کا درجہ دیتے ہیں لیکن بھائی صاحب نے جہاں تک میرا خیال ہے آخری وقت تک بالائی کا استعمال جاری رکھا۔ ہلکے ہارٹ اٹیک ہوئے بھی ہوں گے تو گیس کی تکلیف سمجھ کر چھوڑے جاتے رہے باقاعدہ علاج کی طرف دھیان نہیں دیا ہوگا۔ یوں تو شروع ہی سے مذہب کی طرف مائل تھے لیکن آخر عمر میں کچھ زیادہ ہی مذہبی ہو گئے تھے۔ نمازیں باقاعدہ باجماعت ادا کرتے۔ تہجد پڑھتے اور مذہبی کتابیں ضرورت سے زیادہ

''اقتباس''

شیدااحمد مشتاق (مرحوم)

''جناب عبدالحصی (مرحوم) ایسوسی ایشن کی روحِ رواں تھے۔ انہوں نے اس کی بنیاد رکھی۔''

روئیداد اجلاس عام

مارچ 23، 1974

''جناب عبدالحصی (مرحوم) وہ ہستی تھے جس نے ایسوسی ایشن کی بنیاد رکھی۔ آپ کے دل میں خاندان کے لئے ایک تڑپ تھی۔ آپ خاندانِ حسین پور کو بحیثیت مجموعی اوصاف کا حامل سمجھتے تھے اور آپ کو دن رات یہی لگن تھی کہ یہ خاندان اپنی عظمتِ پارینہ حاصل کر لے۔ آپ نے خاندان کو زوال پذیر ہوتے دیکھ کر ینگ مین حسین پوری ایسوسی ایشن کی بنیاد رکھی۔ دِن رات کام کر کے خاندان کی ترجیحی خصوصیات کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی اور کافی حد تک کامیابی حاصِل کر لی۔ آپ نے عرصہ دراز تک ایسوسی ایشن کی صدارت فرمائی اور اپنی ان تھک کوشش سے اِسے درجہ کمال تک پہنچایا۔ ان کے انتقال سے حسین پوری خاندان کے ایک دور کا خاتمہ ہوگیا۔''

روئیداد اجلاس عام چک جھمرہ

8-9 نومبر 1975ء

ہدیۂ تبریک

انعام احمد صدیقی۔ کراچی

مجھے یہ سُن کر بے حد خوشی ہوئی کہ گذشتہ اجلاس عام بابیوالہ کی طرح امسال بھی بہاولپور میں خاندانِ حسین پور کی معروف بزرگ شخصیت پروفیسر عبدالمحصی (مرحوم) کو خراج تحسین پیش کرنے کے لئے خصوصی نشست کا اہتمام کیا گیا ہے اور اُن کے کارناموں اور شخصیت پر ایک کتاب بھی رقم کی جارہی ہے۔ مجھ سے عزیزی اطہر ضیاء نے ٹیلیفون پر فرمائش کی کہ میں بھی کچھ لکھوں۔ میں نے اس موقع کو غنیمت جانا کہ میں اپنی جانب سے صدر ایسوسی ایشن اور منتظمہ کمیٹی کو مبارکباد پیش کروں کہ اُنہوں نے بانی ایسوسی ایشن کو یاد کرنے کے لئے جو اہتمام کیا ہے یہ اقدام اچھی روایت کو جنم دیتا ہے۔

اپنے بزرگوں کو یاد کرنا اور اخاندانی اقدار کا پرچار نسل نو کی جانکاری کے لئے بہت ضروری ہے۔ بزرگوں کے اقدار کے دہرانے سے ہی خاندانی روایات اور اقدار زندہ رہتے ہیں۔

میں نے جشنِ بابیوالہ کے موقع پر بھی اپنی تحریر میں یہی کہا تھا کہ اس قسم کے جشن اور تقریبات وقتاً فوقتاً ہوتے رہنے چاہیے۔ اس طرح بزرگوں کو یاد کر لیتے ہیں اور ان کے درجات کی بلندی کے لئے دعا کرتے ہیں۔ خاندان کے افراد اور ایسوسی ایشن کی بنیاد میں نئی روح اور نیا خون پیدا ہو جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے بزرگوں کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے اور محترم عبدالمحصی (مرحوم) کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے (آمین) اللہ ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔

کرتے جاتے تھے کہ خدا کرے گاندھی کو کسی مسلمان نے قتل نہ کیا ہو کیونکہ ابھی تک یہ خبر نہ آئی تھی کہ اُنہیں کس نے قتل کیا ہے۔ان کا کہنا تھا کہ اگر مسلمان سے یہ فعل سرزد ہوا ہوگا تو ہندو اور سکھ مسلمانوں پر اور بھی ظلم وستم کے پہاڑ توڑیں گے۔

جی ہاں شاید آپ پہچان گئے ہوں گے کہ یہ دلگداز شخصیت ہر دلعزیز پروفیسر عبدالحصی مرحوم کی تھی۔ ینگ مین حسین پوری ایسوسی ایشن کے بانی بھی یہی تھے۔آپ کے دل میں خاندان کا درد کُوٹ کُوٹ کر بھرا ہوا تھا۔اُن کی خواہش تھی کہ ان کا خاندان کسی دوسرے خاندان سے پیچھے نہ رہے۔آپ خاندان میں تعلیم عام کرنے کے خواہش مند تھے۔آپ کا کہنا تھا کہ اگر خاندان تعلیم یافتہ ہوگا تو وہ کسی سے کسی شعبہ میں بھی پیچھے نہ رہے گا۔نوجوانوں سے اُن کو بہت سی امیدیں وابستہ تھیں۔آپ نے 1940ء میں اس ایسوسی ایشن کی بنیاد رکھی۔1990ء میں ایسوسی ایشن اپنی گولڈن جوبلی منا چکی ہے۔الحمدللہ یہ آج بھی قائم و دائم ہے۔اللہ سے دُعا ہے کہ یہ ہمیشہ قائم رہے اور خاندان کی بھلائی کے لئے سرگرداں رہے۔آمین۔

انگریزی ادب میں ایم۔اے ہونے کے باوجود مشرقیت اُن کی روح میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ایک مرتبہ نجی محفل میں خوش گپیوں میں مصروف تھے۔آپ ایسی محفلوں کی جان ہوا کرتے تھے۔میں نے پوچھا کہ آپ نے انگریزی تعلیم حاصل کی، انگریزی ادب آپ کا اوڑھنا بچھونا رہا ہے لیکن اس کے باوجود آپ کا پہناوا بجائے سوٹ، واسکٹ یا ٹائی کے وہی شیروانی جو ہمیشہ مشرقیت کی پہچان رہی ہے۔اس کی کیا وجہ ہے؟ آپ نے فرمایا بھائی میں نے انگریزی میں تعلیم معاشرے کی ضرورت کو مدِنظر رکھتے ہوئے حاصل کی ہے۔لیکن میرا پختہ ایمان ہے کہ مشرقیت مغربیت سے لاکھوں درجہ بہتر ہے۔مغربیت میں عریانی، خود غرضی، منافقت اور دوسری بہت سی معاشرتی برائیوں میں ملوث ہے۔مجھ جیسا آدمی اپنا ماحول چھوڑ کر کس طرح اُن کے ماحول میں فٹ ہوسکتا ہے۔مشرقیت ہماری پہچان ہے بلکہ ہمیں اپنے اس کلچر پر فخر ہے۔ ہمیں ایسا ہرگز نہ ہونا چاہیے کہ ''کوا چلا ہنس کی چال اپنی بھی بھول گیا''۔

آپ ہمیشہ چھوٹی مانگ دائیں جانب نکالتے۔میں نے کسی موقع پر ان سے پوچھا ایسا کیوں کرتے ہیں۔

پیغام

سکندر عالم، بابیوالہ

بھائی محصی (مرحوم) ایک زندہ دل اور انسان دوست شخصیت تھے۔ اُن کی یادیں اور باتیں کرنے اور لکھنے بیٹھ جائیں تو کبھی ختم نہ ہوں۔ میرا اُن کے ساتھ جو بھی وقت گذرا بہت اچھا اور یادگار گذرا۔ اُنہیں خاندان کی بہت فکر تھی۔ خاص طور پر تعلیم پر بہت توجہ اور زور دیتے تھے۔ اُنہوں نے کئی دفعہ فرمایا کہ اگر خاندان میں تعلیم کا تناسب اچھا ہو جائے تو خاندانِ حسین پور سے غربت کا خاتمہ ہو جائے گا۔ ایک دفعہ بابیوالہ تشریف لائے تو اپنے ساتھ مصبح صاحب کو لے گئے اور اُنہیں وہاں تقریباً دو سال تک خوب پڑھایا۔ وہ کہتے تھے کہ اگر خاندان کا کوئی بچہ تعلیم کی غرض سے میرے گھر آئے اور رہے تو مجھے بہت خوشی ہوگی اور میں تعلیم کے حصول کے لئے اُس کی ہر ممکن مدد کروں گا۔

خاندانِ حسین پور پر بھائی محصی کا احسان ہے کہ اُنہوں نے ینگ مین حسین پوری ایسوسی ایشن کی بنیاد رکھی اور یہ بھی سچ ہے کہ ایسوسی ایشن کی بدولت آج خاندان کے کئی چشم و چراغ عملی زندگی میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں۔

میں ایسوسی ایشن کے اُن تمام عہدیداروں کو مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ اُنہوں نے بھائی محصی (مرحوم) جیسی شخصیت پر ایک اہم اجلاس کا انعقاد کیا ہے۔ عزیزی اطہر میرے پاس بابیوالہ آئے اور مجھے تفصیلات سے آگاہ کیا اور فرمائش کی کہ میں بھی کچھ لکھوں۔ میں محصی صاحب جیسی شخصیت کے لئے کچھ کہنا گویا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف سمجھتا ہوں۔ میں ایسوسی ایشن کے صدر اور جنرل سیکریٹری صاحبان کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ اپنی علالت کے باعث شاید میں جلسے میں نہ آسکوں مگر میرے ان الفاظ کو جلسے میں میری حاضری سمجھا جائے۔ دُعا کرتا ہوں کہ بھائی محصی (مرحوم) کو جنت کا اعلیٰ سے اعلیٰ مقام حاصل ہو۔ آمین۔

میرے بھائی، میرے اُستاد

بہار احمد مشتاق، کراچی

آج موسم بہت خوشگوار تھا۔ آسمان پر کالے کالے بادل چھائے ہوئے تھے۔ ہوا میں خنکی کا احساس بھی ہو رہا تھا۔ کبھی کبھی ہلکی پھوار بھی موسم کو مزید خوشگوار بنانے میں اپنا کردار ادا کر رہی تھی۔ بیرونی لان میں لگی گھاس اپنا سر ہلا ہلا کر ٹھنڈی ہواؤں کو خوش آمدید کہہ رہی تھی۔ کیاری میں لگے پودے خوشی سے جھوم رہے تھے اور اُن پر لگے پھول بھی خوشی سے ایک دوسرے سے گلے مل کر آپس میں سرگوشیاں کرتے نظر آرہے تھے۔ میں یہ دلفریب منظر ورانڈے میں رکھی آرام دہ اور جھولنے والی کرسی میں تقریباً آدھے گھنٹے سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

آج اتوار ہے معاً خیال آیا کیوں نہ عزیز اطہر سے بات کی جائے۔ کورڈلیس فون اُٹھایا اور اسلام آباد کا نمبر ڈائیل کیا۔ دوسری طرف عزیز اطہر ہی تھے۔ سلام دعا اور خیر خیریت معلوم کرنے کے بعد میں نے اُن سے یہاں کے موسم کی رنگینی کا ذکر کیا۔ وہ کہنے لگے یہاں تو بہت تیز بارش ہو رہی ہے اور یہاں بھی آسمان پر کالے بادل چھائے ہوئے ہیں۔ چاروں طرف اندھیرا پھیلا ہوا ہے۔ بارش کے تیور سے اندازہ ہو رہا ہے کہ یہ مزید تیز اور دیر تک چلے گی۔ میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا دسمبر 2009ء ختم ہونے والا ہے۔ اس مرتبہ ایسوسی ایشن کا سالانہ جلسہ کب اور کہاں کرنے کا ارادہ ہے۔ کہنے لگے اس سلسلے میں میں بھی آپ کو فون کرنے والا تھا۔ بہار چچا آپ کو پچھلا اجلاس عام جو بابیوالہ میں ہوا تھا آپ کو یاد ہوگا۔ جس کو جشنِ بابیوالہ کے نام سے موسوم کیا تھا اور اس میں ہم نے بابا عبدالحق مرحوم کی ایک سو پچیسویں سالگرہ اور بابیوالہ کی صد سالہ سالگرہ منائی تھی؟ ہاں ہاں کیوں یاد نہ ہوتا۔ وہ اجلاس عام تو یادگاری اجلاس عام تھا۔ وہ نہ صرف مجھے بلکہ بہت سے ممبران کو ایک عرصہ تک یاد رہے گا۔ کہنے لگے اس مرتبہ اجلاس عام بہاولپور میں کرنے کا ارادہ ہے اور آپ کو یہ سن کر مزید خوشی ہوگی کہ اس مرتبہ بہاولپور میں پھوپھا پروفیسر عبدالمحصی مرحوم جو اس ایسوسی ایشن کے بانی ہیں، ان کی صد سالہ سالگرہ منانے کا ارادہ ہے۔ میں نے کہا

پڑھائی سے بھاگتے ہیں۔ میں تمہاری یہ کمی پوری کردوں گا۔ میرے دل کو یہ بات لگ گئی اور ان کے ساتھ بہاولپور جانے کی ہامی بھرلی۔ بھائی جان (شہید احمد مشتاق مرحوم) کو جب یہ معلوم ہوا کہ میں نے بہاولپور جانے کی ہامی بھرلی ہے تو انہوں نے میری غیر حاضری میں بھائی صاحب سے کہا کہ اس کو ایف۔ اے کے پہلے سال میں داخل کروائیں تاکہ پڑھائی کی بنیادی کمزوری دور ہو۔ بہرحال میں ان کے ساتھ بہاولپور آ گیا۔

دو تین دن کے بعد انہوں نے مجھ سے کہا کہ مجھے یہ بتاؤ کہ تم صرف ایف۔ اے تک تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہو یا بی۔ اے تک پڑھنا چاہتے ہو۔ میں نے کہا آپ نے کہا تھا اس سال ایف۔ اے کا امتحان دلوائیں گے اس کے بعد دو سالوں میں بی۔ اے۔ انہوں نے کہا اس سال ایف۔ اے کا امتحان تو تم انشاء اللہ ضرور پاس کرلو گے لیکن اگلے دو سالوں میں بی۔ اے کرنا ذرا مشکل ہو جائے گا۔ انہوں نے کہا میرا مشورہ یہ ہے کہ تم ایف۔ اے کے پہلے سال میں داخلہ لو دو سالوں میں تمہاری انگریزی اتنی اچھی ہو جائے گی کہ تم اگر کراچی سے بھی امتحان دو گے تو تم اس میں ضرور کامیاب ہو جاؤ گے۔ میں نے ایف۔ اے کے پہلے سال میں داخلہ لے لیا۔ آپ نے پونے دو سال تک مجھے انگریزی ہی پڑھائی اور صرف تین یا چار ماہ دوسرے مضامین پڑھائے۔ پونے دو سال انگریزی پڑھانے کے بعد ان کا کہنا تھا کہ اب تمہیں صحیح انگریزی لکھنا آ گئی ہے اور اب انشاء اللہ بی۔ اے تک تمہیں کوئی فیل نہیں کرسکتا۔ اس طرح میں نے ایف۔ اے بہاولپور سے، بی۔ اے کا پہلا سال کراچی اور بی۔ اے کا دوسرا سال لاہور سے کیا اور ایم۔ اے۔ او کالج لاہور سے بی۔ اے پاس کر کے وہیں سے ڈگری لی۔ اس زمانے میں بی۔ اے کی ڈگری اہمیت رکھتی تھی اور روزگار بھی با آسانی مِل جاتا تھا۔ الحمدللہ میں نے اب تک جہاں بھی ملازمت کی اعلیٰ عہدے پر فائز رہا اور آخر میں سیلز ایگزیکٹو کے عہدے سے ریٹائر ہوا تو میں یہ کہنے میں بالکل حق بجانب ہوں کہ بھائی صاحب مرحوم نے مجھے پڑھا کر واقعی بہت بڑا احسان کیا ہے۔

ذہن میں آتے ہی آپ کی آنکھوں میں نمی ضرور آجاتی۔ آپ بہت سی کتابوں کے مصنف تھے۔ آپ کی پولیٹیکل سائنس کی ایک کتاب یونیورسٹی آف پنجاب نے بی۔اے کے کورس میں بطور ٹیکسٹ (Text) بک کے تجویز کی ہوئی تھی۔ آپ انگریزی گرائمر کی کتاب کے بھی مصنف تھے۔ آپ نے انگریزی گرائمر کو طلباء کے لئے بہت سہل کر دیا تھا۔ اب وہ کتاب ناپید ہے یا شاید خاندان کے کسی فرد کے پاس کوئی جلد موجود ہو تو میرے علم میں نہیں۔

آپ ہمیشہ شیروانی اور علی گڑھی پاجامہ زیب تن کرتے۔ شیروانی کے نیچے کبھی ململ کا یا موٹے کپڑے کا کرتہ نہیں پہنا بلکہ آپ نے ہمیشہ قمیص کو ترجیح دی۔ آپ نے ہمیشہ براؤن شوز استعمال کئے۔ شوز کا ایک ہی ڈیزائن ہمیشہ استعمال کیا جس کی ٹو درمیانی ہوتی تھی۔ جب آپ کراچی تشریف لاتے تو آپ کے مطلب کے شوز صرف الفنسٹن سٹریٹ پر انگلش بوٹ ہاؤس پر ہی ملتے۔ آپ بکری کے بچے کی کھال کے شوز استعمال کرتے تھے۔ اُس کی پہچان آپ اس طرح کرتے کہ اپنے ہاتھ کے انگوٹھے سے شوز کی ٹو کو ہلکا سا دباتے تو انگوٹھے کے نیچے چمڑے پر جُھریاں پڑ جاتیں اور انگوٹھے کا دباؤ ختم کرتے ہی چمڑا اپنی اصلی حالت پر آجاتا۔ آپ فوراً وہ جوتا خرید لیتے۔ اس زمانے میں ان کا جوتا تقریباً -/500 (پانچ سو) میں ملتا تھا جب کہ عام اچھے جوتے کی قیمت چالیس یا پچاس روپے تک ہوتی تھی۔ جس طرح شیروانی اور قمیص کے کفوں کو اپنے کاج میں جانا نصیب نہ ہوا اسی طرح پیر ہمیشہ جرابوں کو ترستے رہے۔ جوتے کے فیتوں کو سب سوراخوں میں پیرو کر فیتوں میں گول اور مضبوط گرہ باندھ لیتے اور ان کو کھوسے کی طرح استعمال کرتے۔ آپ شیروانی کے اندرونی ہک کو ضرور استعمال کرتے۔ قمیص کے کف مومن خان مومن کے کفوں کی طرح ہمیشہ کھلے اور لٹکتے رہتے جن پر شوربے کے دھبے گہرے اور نمایاں ہوتے لیکن بھائی صاحب مرحوم کے کفوں پر کبھی کسی نے دھبہ تو درکنار کف کو کسی کام میں رُکاوٹ بنتے نہیں دیکھا۔ کف کا یا قمیص کے سامنے کا بٹن اگر کپڑوں کی فیکٹری سے ٹوٹا ہوا آتا تو قمیص کے تمام بٹن تبدیل کئے جاتے۔ اس سلسلے میں ان کا کہنا تھا کہ پرانا بٹن اپنا رنگ کھو دیتا ہے۔ ٹوٹے ہوئے بٹن کی جگہ صرف وہاں پر نیا بٹن لگے تو وہ

ہی پیدل کالج جاتے کیونکہ رکشا میں وہ اس لئے نہیں بیٹھتے تھے کہ اس رکشا کو ایک غریب انسان ہی کھینچ رہا ہوتا ہے۔ اس زمانے میں بہاولپور میں سائکل رکشا کا رواج تھا۔ بھائی صاحب مرحوم کو یہ پسند نہ تھا کہ ایک یا دو شخص رکشا میں بیٹھ جائیں اور ایک غریب مسکین شخص ان کو کھینچتا ہوا پسینہ پسینہ ہو جائے۔ شاہی بازار کے شروع میں ہی ایک پان سگریٹ کی دوکان تھی۔ اُس سے وہ سگریٹ کا پیکٹ خریدتے۔ دوکاندار کو 10 روپے کا نوٹ دیتے۔ جتنے پیسے دکاندار واپس کرتا وہ بغیر گنے جیب میں ڈال لیتے۔ بلکہ کسی بھی خریداری کے بعد بچے ہوئے پیسے نہ گنتے۔ پیدل چلتے ہوئے بیکانیری گیٹ (اب فرید گیٹ) سے نکل کر کالج پہنچ جاتے۔

بھائی صاحب کے ناشتے کے بعد میں باورچی خانے میں آجاتا اور لکڑی کی اسی پٹڑی پر بیٹھ جاتا جس پر بھائی صاحب مرحوم ناشتہ کرتے تھے۔ دراصل کالج سے آنے کے بعد بھائی صاحب مرحوم نہا دھو کر تہبند اور بنیان پہن کر پھر چولہے کے آگے آکر بیٹھ جاتے۔ وہیں دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد بڑے کمرے میں چارپائی پر جہاں آپ کی ٹیک کے لئے بستر لپیٹ کر سرہانے رکھ دیا جاتا تھا۔ آپ کالج سے لائی ہوئی کتابوں کا مطالعہ شروع کر دیتے۔ اس دوران اگر کوئی مسئلہ ہوتا تو آپ ان کے سامنے پیش کر دیتیں۔ آپ کتاب کا صفحہ دیکھ کر اُسے بند کر دیا کرتے۔ بچوں میں خود تو کبھی اتنی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ وہ اپنا مسئلہ ان کے سامنے پیش کریں۔ وہ پہلے اپنی امّی سے بات کرتے۔ وہ موقع محل دیکھ کر بچوں کی خواہش بھائی صاحب مرحوم کے سامنے پیش کرتیں۔ بھائی صاحب مرحوم خود بچوں کو بُلاتے اور ہنس ہنس کر اُن کی خواہش ان سے معلوم کرتے اور ان کے حق میں فیصلہ کرتے۔ ان کا مقدمہ چاہے کتنی دیر چلے، بچے کبھی ان کے سامنے بیٹھنے کی جرات نہیں کرتے تھے۔ مکافات عمل اسی کو کہتے ہیں۔ آپ بھی کبھی بات چیت کرتے ہوئے اپنی ماں کے سامنے نہ بیٹھتے خواہ کتنی ہی دیر بات کریں ہمیشہ ان کے سامنے کھڑے ہی رہتے تھے۔

ایک دن میں نے ان سے پوچھا ینگ مین حسین پوری ایسوسی ایشن بنانے کا محرّک کیا تھا؟ آپ نے بہت

اقتباس

اظہر حسن لطیف

8-9 نومبر 1975ء کو اجلاس عام چک جھمرہ میں اظہر حسن لطیف صاحب نے اپنے رفیق کار عبدالحصی مرحوم کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے فرمایا:

''حسین پوری ایسوسی ایشن کے بانیوں میں مرحوم کا شمار صف اوّل میں ہوتا ہے۔ بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ آپ ایسوسی ایشن کے روحِ رواں تھے۔ ان کی شخصیت بڑی پُرکشش تھی۔ وہ اچھی عادات وخصوصیات کے مالک تھے۔ خودداری اور خاندانی انا ان میں بدرجہ اُتم موجود تھی۔ یہ میرا مشاہدہ بھی ہے اور محبت بھی۔ کیونکہ مجھے اُنہیں زندگی کے مختلف مدارج میں بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ مرحوم کا تعلق درس وتدریس کے شعبہ سے تھا۔ وہ کالج کے ہردلعزیز اساتذہ میں سے تھے۔ ان کی زندگی کی قابل قدر متاع مطالعہ تھا۔ اس کو تاحیات انہوں نے نہیں چھوڑا۔ وہ انتہائی سادہ دل اور سادہ مزاج کے انسان تھے۔ ان کی زندگی تصنع اور ظاہری نمائش سے بالکل پاک تھی۔

حسین پوری خاندان سے ان کی محبت اور لگاؤ عشق کے درجہ تک پہنچ جاتا تھا۔

جب موت نے ان کی زندگی میں آ کر جھانکا تو آپ چپ چاپ بغیر کسی کو بتائے ایک لمحہ بھی دیر کئے بغیر اس کی آغوش میں چلے گئے اور اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ دعا ہے کہ خدائے بزرگ وبرتر ان کی مغفرت فرمائے اور انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے۔ آمین''

اقتباس روئیداد اجلاس عام

8-9 نومبر 1975ء چک جھمرہ

آپ کو قسمت کی گئی۔ آخری فقرہ سماعت فرمائیں۔ تھکن اُتارنے کے لئے کچھ قدم آہستہ آہستہ بھی چلا کرتے ہیں اگر اس کی تقلید میں ادھر کی بھی چہل قدمی فرمائیں تو تھکن اتارنے کا تو یقین نہیں دلاتا لیکن یہاں کے ریتیلے علاقے سے آپ کو عرب کی یاد ایک مرتبہ پھر تازہ کرادوں گا۔ اگر آپ ارادہ فرما سکیں تو زہے قسمت۔''

اقتباس روئیداد اجلاس عام، بہاولپور

19-20 نومبر 1980ء

مشعلِ راہ ہوگی۔

خُداوند تعالیٰ پروفیسر عبدالحصیؒ کو اپنی جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور ہمیں توفیق عطا ہو کہ ہم اُن کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے ایسوسی ایشن کی ترقی اور اُس کو فعال بنانے میں اپنا کردار ادا کر سکیں۔ میں اُمید کرتا ہوں کہ عکسِ حیات نسلِ نو کے لئے ایک سنگِ میل کی حیثیت اختیار کرے گی اور قارئین اسے پسند فرمائیں گے۔

بابائے خاندان۔ بابائے ایسوسی ایشن اور میرے بابا

شاہد اطہر، کراچی

مجھے بابیوالہ کے اجلاس عام 2006ء میں موجود اراکین نے نہایت محبتوں کے ساتھ صدر رینگ مین حسین پوری ایسوسی ایشن کا قلمدان سپُرد کیا تو میرے خواب وخیال میں بھی نہیں تھا کہ آئندہ اجلاس عام نہ صرف بہاولپور میں ہوگا بلکہ والدِ محترم کی صد سالہ پیدائش کا سال بھی ہوگا۔ 2009 کے اوائل میں جناب بہار احمد مشتاق، اطہر ضیاء صاحب جنرل سیکریٹری اور میں آپس میں ایسوسی ایشن کے متعلق بات کر رہے تھے تو میری توجہ اس طرف دِلائی کہ 2009 بانی ایسوسی ایشن کی صد سالہ پیدائش کا سال ہے۔ جلسہ بہاولپور میں منعقد کیا جائے اور جشن بابیوالہ کی طرز پر ایک خصوصی نشست بھی منعقد کی جائے۔ اطہر صاحب کی تجویز تھی کہ بانی ایسوسی ایشن کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لئے ان کی شخصیت، ان کی علمیت اور خاندانِ حسین پور کی خدمات پر ایک مرصّع اشاعت بھی عمل میں لائی جائے۔ میں نے کہا کہ یہ ایک محنت طلب اور ذمہ داری کا کام ہے۔ اطہر صاحب نے میری ہمت بڑھائی اور کہا کہ آپ منظوری فرمائیں انشاءاللہ یہ کام بخوبی ہو جائے گا۔ اور والدِ محترم پر ایک مضمون لکھنے کی فرمائش بھی کی۔ میں اس سے پہلے مفصّل مضمون تحریر کر چُکا ہوں جو ''روشن یادیں'' میں شائع ہو چکا ہے۔ اُسی مضمون سے استفادہ کرتے ہوئے یہ کاوش کر رہا ہوں۔ مگر ایک دفعہ پھر یہ خیال آ رہا ہے کہ میں اپنی اس تحریر سے والدِ محترم کی ذات سے انصاف کر سکوں گا یا نہیں۔

اگر مختصر الفاظ میں ان کی شخصیت کا جائزہ لوں تو والد صاحب کے بارے میں خاکہ کچھ اس طرح بنتا ہے کہ ان کا قد طویل نہ قلیل یعنی متوسط قامت، اکہرا بدن، چہرہ کتابی، آنکھوں میں چمک، فطرت کم آمیز، فکر واستغنا کے پیکر، حافظہ بے پناہ، کتابوں کے دوست، بلکہ کتابوں کے کیڑے، مطالعہ کے مجنوں، کئی زبانوں کے انسائکلو پیڈیا، از حد نفاست پسند، صاحبِ ذوق اور بہترین حسِ مزاح کے مالک غرض ان کی

دیکھو شیر کی نگاہ سے' کے علم بردار تھے۔ انہوں نے اولاد کے ساتھ کبھی سختی نہیں کی۔ ان کی نگاہیں ہی ہمارے لیے کافی ہوتی تھیں۔ اس طرح انہوں نے کسی بچے کو گود میں لے کر پیار بھی نہیں کیا۔ حالانکہ وہ اولاد سے بہت محبت کرتے اور شفقت سے پیش آتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ ظاہری محبت کے قائل نہیں اس طرح وہ زیادہ سختی اور زیادہ پیار دونوں کو اولاد کی پرورش کے لئے سمِ قاتل سمجھتے تھے۔

والد صاحب میں کچھ ایسی خوبیاں تھیں جو ان سے ایک دفعہ ملتا وہ ہمیشہ ان کا ہی ہو کر رہ جاتا۔ کسی پر وعظ نصیحت کا بوجھ نہیں لادتے تھے بلکہ ہنسی مذاق میں اصلاح کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ ان کے ملنے والوں میں جہاں پڑھے لکھے لوگ ہوتے تھے وہاں پر بہت سے سادہ اور ان پڑھ لوگ بھی شامل ہوتے تھے۔ وہ ہر طرح کی صحبت سے لطف اندوز ہوتے۔ حتیٰ کہ ہر شخص سمجھتا تھا کہ پروفیسر صاحب اسی سے سب سے زیادہ محبت کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی ہر شخص ان کو اچھے الفاظ میں یاد کرتا اور اپنی ملاقات پر فخر کرتا ہے۔

ایک اہم وصف ان کی نفاست پسندی کا تھا۔ وہ خوراک، پوشاک، رہن سہن، بول چال، لکھا پڑھی، اُٹھک بیٹھک، بات چیت، غرض صبح وشام کے ہر دائرے میں نفاست پسند تھے۔

؎ سفرِ حیات کا ہر قدم نفیس تھا

نہایت شستہ مذاق کرتے۔ پھکڑ بازی کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ کوئی بات ان کی مرضی کے خلاف یا سوچ سے مختلف ہوتی تو ان کے اعصاب میں تناؤ پیدا ہو جاتا تھا لیکن اس کے باوجود غُصّہ نکالنا یا کھلم کھلا اس کا اظہار کرنا گوارہ نہ کرتے۔ جہاں ایک بار اعتماد ہل جاتا وہاں کبھی بھی بھروسہ نہیں کرتے تھے لیکن اس شخص کو یہ معلوم نہیں ہونے دیتے کہ وہ اس سے ناراض ہیں۔

طوالت کے خوف سے والد صاحب کی زندگی کے چند پہلو بیان کئے اور کوشش کی جو لکھا جائے ناپ تول کر لکھا جائے، جس رنگ میں پایا اسی میں بیان کیا جائے۔ کیونکہ میں سمجھتا ہوں انسانی سیرت کے معاملے میں بخل اور فیاضی دونوں ہی خطرناک ہو سکتے ہیں خاص طور پر اگر وہ شخص آپ کا قریبی عزیز یا بزرگ ہو۔

بہر حال موت سے کس کو فرار ہے۔ والد صاحب ہمیں زندگی کے تھپیڑوں سے نبرد آزما ہونے کے لئے

لمحۂ مسرّت

مغیث احمد صمدانی۔ بابیوالہ

میں ایسوسی ایشن کے صدر جناب شاہد اطہر کو ڈھیروں مبارکباد کا مستحق سمجھتا ہوں جنہوں نے اپنے والد اور ہمارے بزرگ بانی ایسوسی ایشن جناب عبدالمحصیؒ کے صد سالہ پیدائش کے موقع پر اجلاس عام بہاولپور کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔ دراصل بزرگوں کو یاد کرنا اور اُن کو خراجِ تحسین پیش کرنا کسی عبادت سے کم نہیں ہے۔ خاص طور پر اس خوبصورت اور مبارک موقع پر جناب عبدالمحصی (مرحوم) کی شخصیت پر خصوصی جریدے کی اشاعت قابلِ ستائش اور قابلِ مبارکباد اقدام ہے۔ میں ایسوسی ایشن کی منتظمہ کمیٹی کو دل کی گہرائیوں سے مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ میں بارگاہِ ایزدی میں دعا گو ہوں کہ وہ پروفیسر عبدالمحصی (مرحوم) کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ ہمیں صحیح معنوں میں اپنے بزرگوں کو یاد کرنے اور اُنہیں خراجِ تحسین پیش کرنے کی توفیق عطا فرمائے (آمین)

والسلام

ایک دانشور جو رہتا ہی کتب خانے میں تھا
اُس کو جاہل گورکن مصروف دفنانے میں تھا

اس واقعے کے چند روز بعد جب والدین کے پاس کابل پہنچا تو والدِ محترم حافظ ضیاء احمد (مرحوم) انتہائی عظموم تھے۔ آپ سے جب میں نے اُن کی وفات کا تمام واقعہ بیان کیا تو خاموشی سے سنتے رہے اور آنکھیں پُرنم ہوگئی۔ فرمانے لگے بھائی محصی ایک باعلم شخصیت ہونے کے ساتھ ساتھ سادگی کا نمونہ تھے۔ اُن کے سینے میں دوسروں کے لئے کچھ کرنے کی تڑپ تھی۔ وہ ہر چھوٹے بڑے سے اچھی طرح ملتے جلتے تھے اُن کی سب سے بڑی بات یہ کہ خاندان کو عروج پر دیکھنا چاہتے تھے وہ واقعی باعمل انسان تھے جو سوچا کر دکھایا۔ ایک فعال ایسوسی ایشن قائم کی افرادِ خاندان کو اُس کا ممبر بننے کے ساتھ ساتھ ایک ایسا جذبہ دے گئے کہ یہ ایسوسی ایشن زندہ و جاوید ہے۔

سکھاتے ہی رہے دنیا کو آداب جہاں بانی
جو خدمت ہو تو ایسی ہو ہدایت ہو تو ایسی ہو

میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ جناب عبدالمحصیؒ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ سے اعلیٰ مقام حاصل ہو اور ہمیں اُن کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے (آمین)

خطبۂ صدارت

جناب عبدالمحصی صاحب ایم۔اے

صدر سالانہ اجلاس منعقدہ کراچی بتاریخ ۲۶/۲۵ دسمبر ۱۹۴۸ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بزرگان محترم و برادران عزیز۔ السلام علیکم۔

ہماری جبینِ نیاز سجدہ ریز ہے اس بے چون و بے چگوں کی بارگاہ ارفع و اعلیٰ میں جس کی ذات رب المشرقین بھی ہے اور جامع المغربین بھی۔ جو عزت و عظمت۔ تسفل و تذلل کا مالک ہے جس کے قبضہ میں حیات بھی ہے اور ممات بھی۔ جو خزانوں کا مالک ہے جن میں قسام ازل کی حیثیت سے کسی کو لعل و گوہر سے بھی بے نیاز کر دیتا ہے اور کسی کو پھٹی ہوئی گدڑی کا محتاج۔ ہم سراپا منت و سپاس ہیں کہ اس ذات لم یزل ولایزال نے ہم میں سے ایک کثیر تعداد کو مشرق کی دہکتی ہوئی بھٹی سے جس کے شعلے آسمان کی بلندیوں سے چشمک زنی کر رہے تھے۔ خلیل آسا۔ رستگاری بخشی اور ہمیں جو خزاں کے زرد پتوں کی طرح اپنے شجر سے علیحدہ۔ بہار کی آمد سے ناامید۔ اپنی منزل سے بے خبر آوارہ ازیں کوچہ باآں کو پھر رہے تھے۔ ہمارے عیوب و ذنوب کے باوجود ایک محفوظ اور مصئون مقام پر ایک مرتبہ پھر جمع کر دیا۔ ہم شکرگزار ہیں کہ مصیبت و ابتلا کے اس زمانے میں جس کا تصور ہمارے لئے اب بھی لرزہ براندام خیز ہے اس نے ہماری عزتوں اور جانوں کو اپنے دامن رحمت و رافت میں امان دی اور ہم ایک بار پھر کم از کم نقصان کے ساتھ اپنی زندگی کا ایک نیا دور شروع کر سکے۔ ہم اس کے الطاف و کرم سے یقین رکھتے ہیں کہ رحم و فضل بھی شامل رہے گا، انشاءاللہ۔

حضرات ! انسانی زندگی کا جامہ دو مختلف اور متضاد رنگوں سے بنایا گیا ہے۔ یہاں پر پُرمسرت تبسم کے پیچھے ڈھلکتا ہوا آنسو نظر آتا ہے۔ یہاں بہار کے ہنستے ہوئے پھول کے پس پردہ خزاں دیدہ پتہ کا زرد چہرہ دکھائی دیتا ہے۔ یہاں آپ کو فردوس گوش قہقہے کے ساتھ ایک دلخراش چیخ سنائی دے گی۔ یہاں ہر ایک سریلا گیت۔ رنج و الم ایک غمناک افسانہ سناتا معلوم ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں ہم نے گذشتہ دو طوفانی سالوں میں اپنے دامن مراد کو چند پھولوں سے بھرا وہاں چند کانٹے بھی چبھے جن کی کسک امتداد زمانہ کے باوجود ہم اب تک محسوس کر رہے ہیں۔ میری مراد اس نقصان عظیم سے ہے جو ہمیں جناب قبلہ ڈپٹی محمد شریف صاحب۔ جناب قبلہ حافظ محمد ابراہیم صاحب آزاد۔ جناب قبلہ عبدالستار صاحب۔ برادر عزیز عباس رسول کی المناک اموات کی شکل میں برداشت کرنا پڑا ان میں تینوں محترم بزرگ بلاشبہ عمر طبعی کو پہنچ کر اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ لیکن اگر ہماری تہی دستی اور تہی دامنی ان گوہر ہائے گراں مایہ کے کھوئے جانے پر خونناب فشانی پر مجبور ہے تو میرے خیال میں یقیناً حق بجانب ہے ان میں سے کسی کے متعلق عرض کرنا چھوٹا منہ بڑی بات ہوگی۔ حضرات حسینی پوری خاندان کا وہ ملاپ قبلہ محمد یوسف صاحب مرحوم، جناب بابو عبدالحق صاحب مرحوم وغیرہ کی عدم موجودگی میں خاندان کی بے یارومددگار کشتی کا

قوتِ ارادی کا مالک یہ یقین رکھنے والا نوجوان یہ آہنی عزم کا انسان اپنی مختصر سی عمر کے ایک زیادہ حصہ میں بیماریوں سے مردانہ وار لڑتا رہا اور نہ ہارا۔ یہاں تک کے موت نے اُسکے رشتہ حیات کو منقطع کر دیا اور اس طرح یہ شہاب ثاقب اپنی چکا چوند کرنے والی روشنی سے کچھ عرصہ کے لئے ہماری نگاہوں کو خیرہ کر کے غائب ہوگیا اور اس طرح یہ سحاب کرم، اپنے خاندان کو اپنی محبت و اُلفت کی بارش سے کرنے سے پہلے منتشر ہوگیا اور اس طرح ایک حباب کی طرح اُبھرتے ہی فنا کی آغوش میں سوگیا۔ ہم اپنی بدقسمتی پر جس قدر ماتم کریں کم ہے کیونکہ مجھے یقین ہے کہ ایسا گوہر شب چراغ درشہوار العل درخشاں قدرت کم خوش قسمتوں کو ارزاں کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ عباس مرحوم کو اپنی جوارِ رحمت میں بلند سے بلند مرتبہ عطا فرمائے، آمین۔

اب مجھے اُن یوسفان گم گشتہ یعنی عزیز محمد اشرف خلفِ جناب عبدالروف صاحب و عزیز محمد بقا بمشیر زادہ جناب محمد کلیم نعیم صاحب کا ذکر کرنا ہے جنکی یاد میں بہت سی آنکھیں دیدۂ یعقوب کی طرح روزن دیوار بن چکی ہیں۔ لیکن ہم لاتقنطوا من رحمت اللہ پر ایمان رکھنے والے دیدۂ یعقوب سے صبرِ ایوبؑ کی توقع رکھتے ہیں کیونکہ ہمارے کانوں میں سروش غیبی لسان الغیب حضرت حافظؒ کے الفاظ میں یہ مژدۂ جاں بخش سناتا ہوا معلوم ہو رہا ہے کہ ''یوسف گم گشتہ باز آید بکنعاں غم مخور'' حضرات اس وقت میں آپ اور آپ کی ایسوسی ایشن سے بے خبر دوسری دنیاؤں کے رہنے والوں میں پھرتا رہا اور اِس طرح ایسوسی ایشن کی دنیا کے تلخ حقائق سے نا دانستہ گریز کرتا رہا۔ مگر تا بکے اب آپ ہوں گے۔ ایسوسی ایشن ہوگی اور میں۔

حضرات! ایسوسی ایشن۔ اُس کی صدارت اور میں یہ ایک ایسی مثلث تھی جس کی تشکیل کے سلسلہ میں میں اگر آپ کی قوت انتخاب کے دیوالیہ ہونے کے متعلق بالواسطہ یا بلا واسطہ ذرہ بھر بھی شبہ کر سکتا تو میں بجا طور پر عوامی زبان میں اُسے ''تکزم'' سے تعبیر کرتا جس کو آپ کی طفلِ آسا شوخی، یارندانہ جرأت نے اس لئے روا رکھا تا کہ آپ آٹھ، نو سال کے سخت اور تھکا دینے والے کام کے بعد کم از کم ایک مرتبہ ایسوسی ایشن کو پاسبانِ عقل سے رہائی دلا کر اور اِس طرح اُسے تنہا چھوڑ کر وہ تماشہ دیکھ سکیں۔ جو عام طور پر چہروں پر ایک مسرت آمیز مسکراہٹ اور اعصاب میں ایک خاص قسم کا سکون آفرین ڈھیلا پن پیدا کر دیتا ہے۔ مگر چونکہ میں آپ کی ذہانت اور دور بینی کی جتک کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا اِس لئے مجھے یقین ہے کہ اگر صدارت کے گول سوراخ میں ایک چوکور میخ گاڑ دی گئی تو یہ ایسی لغزش تھی جو حضرتِ انسان نے اپنے نیک ارادوں کے باوجود حضرتِ آدم سے تا ایندم ہمیشہ کرتا آیا ہے جس پر وہ ہمیشہ پچھتاتا ہے اور جس کی تلافی کے لئے اولین موقع کا منتظر رہتا ہے مجھے امید ہے کہ آپ آج ایک حد تک مطمئن ہوں گے کہ اِس سالانہ جلسہ میں جو آپ کی اُمیدوں کے خلاف اور دوسروں کی تمناؤں کے باوجود دو سال کے طویل عرصہ کے بعد منعقد ہو رہا ہے آپ اپنی غلطی کی تلافی کر سکیں گے مجھے افسوس ہے کہ اس عام اطمینان و سکون میں میرا کوئی حصہ نہیں۔ کاش میں اپنی صدارت کے اعمالنامہ میں سے اپنی کارکردگی کا کوئی ورق اپنی سفارش کے طور پر پیش کر سکتا۔ جب نگاہ ڈالتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ گو اوراق سیاہ تو نہیں لیکن صاف اور کورے ضرور ہیں۔ بایں ہمہ مجھے اُمید ہے کہ آپ میری اُس مسرت کو جو ان حالات میں میرے ذہنی اور دماغی سکون کے لیے تنکے کے سہارے کی حیثیت رکھتی ہے۔ چھیننے کی کوشش نہ فرمائینگے جو میں اس امر میں محسوس کر رہا ہوں کہ اگرچہ میں ''کارے کردم'' کا دعویٰ تو نہیں کر سکتا لیکن میں نے کم از کم اُس شخص کی طرح جو علامہ رازیؒ کے الفاظ میں ''نیز خیر خو

بد ہے۔ اگر ہم ایسوسی ایشن کے اغراض و مقاصد کی بلندی اور اپنی ذاتی خواہشات کی پستی میں فرق کرنے کے لئے تیار نہیں تو میرے خیال میں اب جبکہ نماز ختم ہو چکی ہے ہمیں مصلے اُٹھانے کی فکر کرنی چاہیئے۔ جہاں تک میرا علم ہے بعض اصحاب اِس سالانہ جلسہ کو اِسی مقصد کی تکمیل کے لئے ذریعہ بنانا چاہتے تھے۔ اگر اس عرصہ میں اُن کی ماہیت قلب نہیں ہوئی تو ہمیں واقعی طور پر اس جلسہ سے فائدہ اُٹھا کر انفرادی اور اجتماعی حیثیت سے کسی فیصلہ کن نتیجہ پر پہنچنے کی کوشش کرنا چاہیئے ظاہر ہے کہ ہم بقول داغؔ مرحوم ایک ہی وقت میں کعبے کی تمنا اور کوئے بتاں کی ہوس نہیں کر سکتے۔ اگر ہمیں اپنے ذاتی اغراض اور ایسوسی ایشن کے جماعتی مقاصد میں ہر لحہ تصادم کا ڈر ہے۔ اگر ہم بیسویں صدی کی مادیت کے زمانے میں انانیت اور خود غرضی سے اس قدر مغلوب ہو چکے ہیں کہ اخلاقی اور روحانی قدریں ہمارے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتیں تو بیسویں صدی ہی کی بے تکلفی اور بے لحاضی سے کام لیتے ہوئے ایسوسی ایشن کو ''ما بخیر شما سلامت'' کہہ کر علیحدہ ہو جانا چاہیئے تا کہ ایسوسی ایشن جیسا کہ وہ اب ایک حد تک صرف ایک گڈریا ہی بن کر نہ رہ جائے۔ جس کا ایک اہم فرض بھٹکتی ہوئی بھیڑوں کو بار بار گھیر کر لانا ہو۔ میں شائد سخت الفاظ استعمال کر رہا ہوں۔ مگر میں اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر اور ایسوسی ایشن کے مفاد میں یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ ۱۹۴۷ء کے اس انقلابِ عظیم کے بعد جس نے اس برصغیر کے ہر رہنے والے انسان کی زندگی کے ہر شعبہ میں ایک انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ ہمیں اس مسئلہ پر پوری سنجیدگی سے غور کر لینا چاہیئے کہ آیا ہمیں ایسوسی ایشن کی اور ایسوسی ایشن کو ہماری ضرورت ہے یا نہیں بالفاظِ دیگر آیا وہ ہمارے تبدیل شدہ رجحانات۔ خواہشات اور تمناؤں کی ترجمان بن سکتی ہے یا نہیں اور آیا ہم خود بھی اُس کے ہر دم بڑھتے ہوئے تقاضوں کو پورا کرنے کی تڑپ اپنے دِل کی گہرائیوں میں محسوس کرتے ہیں یا نہیں اگر ہماری ہلکی جیسی تبدیل شدہ خیالات ایسوسی ایشن کی گزشتہ ناکامیاں اُس کے موجودہ مقاصد سے اختلاف یا اُس کے مستقبل سے مایوسی آپ کو ان دونوں سوالوں کا جواب نفی میں دینے پر مجبور کر رہی ہے تو آپ اس کی خامیوں اور کوتاہیوں کو بڑھا چڑھا کر اور اُنکی تشہیر کرنے کے بجائے ایسوسی ایشن کو اُس کی حالت پر ڈوبنے یا تیرنے کے لئے چھوڑ دینا چاہیئے۔ اس صورت میں شائد ایسوسی ایشن کی کچھ صفیں خالی ہو جائیں لیکن اگر وہ اس حالت میں وجود کو برقرار رکھ سکی تو اُسکی بنیادیں صحرا کے رتیلے تودوں پر ہونگی جو ہوا کے ہر جھونکے پر اپنی جگہ بدل دیتے ہیں بلکہ اُن آہنی و سنگین چٹانوں پر ہوگی جو موسم و حالات کے تغیرات سے بے خبر اپنے منصبی فرائض کی ادائیگی کے لیے اپنی جگہ پر غیر متزلزل طور پر ثابت قدم رہتی ہیں۔ اُس وقت اُس کا ہر ممبر کیوں۔ کیا اور کس طرح کی پیدا کردہ دماغی اور ذہنی الجھنوں سے آزاد ایک پُر جوش اور پُر خلوص سپاہی کی طرح ''کرنے یا مرنے'' کے لئے تیار ہوگا اور اگر وہ ممبران کی تعداد کی کمی کو برداشت نہ کر سکی تو اُس کے لیے واحد چارہ کار یہ ہوگا کہ وہ ''ہرا کری'' کرے جو میرے نزدیک اس لئے قابلِ مدانعت فعل ہوگا کہ یہ اُس کا کھلا اعتراف ہوگا اِس امر کا کہ وہ اپنے تمام ارادوں اور کوششوں کے باوجود اپنے فرض کو اپنی مجبوریوں کی وجہ سے ادا کرنے سے قاصر رہی اور وہ اُس کا اعلان ہوگا اِس حقیقت کا کہ ؎ من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم۔ کہ بامن ہر چہ کرد آشنا کرد۔ اس کے بعد ہمارا کام صرف یہ ہوگا کہ کہ ہم ''اِیں دفتر بے معنی غرق مئے ناب اولے'' کہتے ہوئے ذاتی اغراض کے گھنے جنگل یا سنہری طلسم میں کچھ اس طرح کھوئے جائیں کہ ہمیں خود ہی ہماری خبر نہ ملے چہ جائیکہ دوسروں کو اِس کا علم ہو کہ ہم کون ہیں اور کہاں ہیں لیکن اگر ان سوالات کے جواب اثبات میں ہیں اور آپ کی شکایت ایسوسی ایشن کے کارکنان سے ہے تو آپ کو اُنکی کارکردگی کا سخت ترین جائزہ لینے میں قطعاً کوئی تامل نہ ہونا چاہیئے اور اگر منتظمہ کمیٹی نمائندہ جماعت بننے سے قاصر ہے تو آپ کا یہ پہلا اخلاقی اور جماعتی فرض ہے کہ آپ نہ صرف اس کے برخلاف

کی تیزی سے رواں دواں ہے۔ اپنی بیزاری کا اظہار اپنی چیں بجبیں سے کریں لیکن اگروہ "پیشہ ور رجائیت پسند" نہیں تو اُن کو انسانی تاریخ کے اس تمسخر اور مذاق کو سمجھنے میں زیادہ دقت نہ ہوگی کہ وہ موجودہ زمانہ کے انسان کو مستقبل کے "عہد زریں" کے تخیلی طلسم میں پھنسا کر خود ایک محتاط اور حاسد ماں کی طرح اصل سنہری زمانہ کو اپنے پرانے اور بوسیدہ اوراق میں جنہیں ہم اپنی کم یاب اور نادر روزگار کتابوں سے عشق و محبت کی نمائش کے لئے خوبصورت اور قیمتی الماریوں میں "گلدستہ طاق نسیاں" بنایا کرتے ہیں۔ کچھ اس طرح چھپائے ہوئے ہے کہ ہم اُس سے بےخبر اور لاعلم ہر اُس رہزن کے ساتھ جو رہبری کا دعویٰ کرتا ہے اسی "جنت الحمقا" کی تلاش میں نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ ممکن ہے کہ آپ اس حقیقت سے انکار کریں لیکن اگر انسان کی زندگی میں مذہب ایک اہم مقام کا مالک ہے تو مجھے یقین ہے کہ انسان کے "عہد ہائے زریں" صرف زمانہ ماضی میں ہی مل سکتے ہیں جبکہ اولوالعزم پیغمبر اور ان کے رفقا گم کردہ راہ انسان کو انسانیت کا سبق دے رہے تھے اس لئے اگر ذوق مرحوم کی رائے میں حق نے ہمیں ایک زبان اور دو کان اس لیے دیئے ہیں کہ ہم دو سُن کر ایک کہیں۔ تو میرے خیال میں یہ بھی صحیح ہے کہ ہمیں دو آنکھیں اس لئے عطا کی گئی ہیں کہ ایک آنکھ ماضی پر نگاہ رکھے اور دوسری حال اور مستقبل کو دیکھتی رہے بالفاظِ دگر انسان ماضی کو مستقبل سے علیحدہ نہیں کر سکتا اور یہ ہی وجہ ہے کہ میں آپ کو رجعت قہقری کی دعوت دے رہا ہوں تاکہ آپ مستقبل کے متعلق صحیح راہِ عمل متعین کر سکیں۔

حضرات! میں ماضی کی اس ضخیم کتاب میں سے صرف ایک صفحہ یا اُس سے بھی کم کوشش کروں گا اور وہ صفحہ ہمارے خاندان حسین پور سے تعلق رکھتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ جونہی ہماری نظر اُس صفحہ پر پڑے گی تو ہم اپنے سامنے ایک ایسی دنیا آباد پائیں گے جو ہماری استعجاب اور حیرت کے لیے اس قدر ہی نئی ہوگی جیسا کہ اٹھارویں صدی کے ایک دیہاتی کے لئے ہمارے بیسویں صدی کی موجودہ دُنیا۔ فرق اسقدر ہوگا کہ ہماری دُنیا طبعیاتی اور میکانکی اصولوں کے سہارے مشین اور بجلی کے زریعہ چلتی ہے اور دنیا محبت اور نیکی کے غیر متبدل فطری اصولوں پر قائم تھی۔ اُس وقت ایمانداری خود اپنا انعام تھی جب کہ اس زمانہ میں ایمانداری بہترین پالیسی سمجھی جاتی ہے۔ اُس دنیا میں ہر زبان پر اللہ اللہ تھا۔ ہماری دُنیا میں ہر منہ میں رام رام ہے اور بغل میں چھری۔ اُس وقت دوسروں کی تکلیفوں اور مصیبتوں پر دِل غم کے آنسو بہاتا تھا۔ اب دوسروں کی تباہی و بربادی پر آستینوں میں ہنسا جاتا ہے۔ اُس وقت ایک دوست "پریشان حالی اور درماندگی" کی حالت میں "میر دوستِ دوست" پر عمل کرتا تھا اب "تک نگاہ چوکی اور مال دوستوں کا" پر عمل ہوتا ہے اُس وقت دشمن نادان دوست سے بہتر تھا۔ اور دوست کی موجودگی میں آسمان کو دشمنی کرنے کی ضرورت نہیں رہتی اُس وقت اللہ کی رحمتیں ہر ان دو اشخاص کے لئے وقف ہیں جو کسی کی مالی یا اقتصادی مدد کرتا ہے اور جس کی مدد کی جاتی ہے۔ الغرض ہم اُس صفحہ پر بالکل ایک نئی دُنیا آباد پائیں گے جس کی زمین ہمارے آسمان سے بلند اور جس کا آسمان ہمارے ادراک کی سرحد سے دور اور بہت دور تھا یہ تھے اگلے وقتوں کے لوگ اور ہمارے آبا و اجداد جن کے متعلق میں نے آپ سے چند باتیں عرض کرنے کی اجازت چاہی ہے۔

حضرات! ہمارے بزرگ شائد اٹھارویں صدی میں حسین پور میں آباد ہوئے تھے اور ایک کافی طویل عرصہ تک وہیں اپنے شجرِ خاندان کی آبیاری کرتے رہے اور باہمی تعاون و اشتراک استعداد و استعانت کی بدولت اِس قدر پھولے اور پھلے کہ انیسویں صدی میں حسین پور کی محدود زمین نے اُنہیں قوتِ لایموت مہیا کرنے سے انکار کر دیا۔ اب ہمارے یہ بزرگ ہر "ہر ملک ملک ماست کہ ملکِ خدائے ماست"

محبت پر جواُن کو اپنے وطن سے تھی میں فخر کرتا ہوں اُن کے غیر محدود جودوکرم پر اور اُن کی اُس بلند درویشانہ زندگی پر جو وہ گنا ہوں سے بھری ہوئی دنیا کے درباروں اور خانقاہوں میں بسر کرتے تھے۔ میں آخر میں فخر کرتا ہوں اُن محترم ومقدس بزرگوں پر کہ اُن کو غیروں کی کافرانہ ادائیں آزرانہ تراشیں۔ بیگانوں کی چمک دوسروں کی ملمع شدہ مصنوعی اشیاء کا رُعب اُن کو حسین پوری خاندان کی محدود لیکن پرسکون جنت سے نکالنے میں کامیاب نہ ہوسکا۔ حضرات یہ ہمارے بزرگ جو دوسروں کی دنیا کی خود تخلیق کیا کرتے تھے اور یہ تھا ہمارا خاندان۔ حضرات۔ ہمارا یہ خاندان دراصل ایک خوبصورت طاؤس تھا جو اپنے دلفریب اور مسحورکن رنگین پروں کو پھیلا کر ایک تنہا مقام پر دوسروں کی راہ مستغنی اپنی خواہش کے مطابق اپنی جنت خود بنالیتا ہے۔ وہ ایک آہستہ خرام چشمہ تھا جس کی نقرئی لہریں۔ مطلب پرست اور وفا نا آشنا انسانوں کی دنیا سے دور محبت و اُلفت کے آسمانی گیت گاتی ہوئی اپنا علیحدہ راستہ بنانے میں مصروف رہتی ہیں وہ ''تیری یا میری دنیا'' سے بہت بلند اُخوت و مساوات کی آسمانی بلندیوں پر اُڑنے والا ایک شاہین تھا جسے اقبالؔ مرحوم کے الفاظ میں اپنی راہبانہ فطرت کی وجہ سے بیانوں کی خلوتیں خوش آتی تھیں۔

حضرات! ان کے علاوہ اور کچھ بھی تھا۔ وہ ایک ایسا گھنا درخت تھا جس کی پھلوں سے جھکی ہوئیں شاخیں آفتاب کی تمازت میں اپنوں اور پرایوں کو یکساں طور پر پناہ دینا اپنا فرض سمجھتی تھیں۔ وہ آفتاب تھا جو خود کسی دوسرے سیارہ سے اکتساب نور کئے بغیر اپنی روشنی دوسرے سیاروں میں اُگنے والے بے یار ومددگار پودوں کی نشو ونما کے لئے پورے خلوص سے وقف کر دیتا تھا گو یہ ہمیشہ اُس کی بدقسمتی رہی کہ اُس پودے نے جو اُس کی روشنی میں پل کر درخت بنا سب سے پہلے گردن اُٹھا کر اس پر ہی تھوکنے کی کوشش کی۔ مگر وہ اسکے باوجود اپنی نور کی روشنی برساتا رہا۔ اور اب جب کہ اُس کی اپنی روشنی اپنے ہر دم بڑھتے ہوئے داغوں سے کچھ کم ہو رہی ہے اگر وہ آئندہ کچھ عرصہ کے لئے ایسا نہ کر سکے تو میرے خیال میں وہ سزاوار ملامت نہیں۔

حضرات! جب میں یہ لکھ رہا تھا مجھے بار بار وہ پرانا اور مبتذل طنز سنائی دے رہا تھا کہ آپ نے ''پدرم سلطان بود'' کی تفسیر تو خیر جیسی کی۔ ٹھیک مان لی جاسکتی ہے۔ لیکن آپ خود کیا ہیں اور آپ کی موجودہ حیثیت کیا ہے۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ جس طرح میں نے ایمانداری کے ساتھ اپنے بزرگوں کی خوبیوں اور خصوصیتوں کو مختصر کرنے کی کوشش کی ہے بالکل اسی طرح اپنے متعلق بھی بلاکم وکاست عرض کرنے کی کوشش کروں گا فی الحال مجھے اجازت دی جائے کہ میں اپنے خاندان کے کاروان کو بیسویں صدی میں داخل ہوتے ہوئے دیکھ سکوں۔ کیونکہ اس سے نہ صرف میں اپنے بیان کے تسلسل کو قائم رکھ سکوں گا بلکہ اپنی موجودہ حالت کا پس منظر بھی زیادہ واضح طور پر پیش کر سکوں گا۔ تا کہ ہماری موجودہ حالت کا صحیح تر نقشہ آپ کی نگاہوں کے سامنے آسکے۔ حضرات جس وقت ہمارا کارواں بیسویں صدی میں داخل ہوتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ اپنے اوصاف حمیدہ اور صفات ستودہ کے علاوہ ایک اور کم یاب اور نادر شئے بھی لایا جس کا ذکر میں اس سے قبل کرنا بھول گیا تھا اور وہ تھی انجمنِ خاندانِ حسین پور۔ یہ انجمن بیسویں صدی کے جمہوری اصولوں پر تشکیل دی ہوئی ایک ایسی جماعت تھی جسکے صدر اور سیکریٹری اور خازم وغیرہ بالکل اُسی طرح منتخب ہوئے تھے جیسا کہ آج کل ترقی یافتہ جماعتیں کرتی ہیں۔ یہ صرف ہمارے خاندان کو فخر حاصل ہے کہ اس وقت جبکہ ہندوستان کی اکثر بڑی جماعتیں بھی وجود میں نہ آئیں تھیں۔ ہمارا خاندان جمہوری اصولوں پر اعتقاد رکھنے اور عمل کرنے والی انجمن کی شکل میں متحد تھا اور اپنے اس دعوے کے ثبوت میں ستر سال سے زیادہ پرانا لٹریچر اب بھی پیش کر سکتا ہے۔ میں خود ۱۹۰۵ء کے جلسہ کی

سیاروں کے لئے باعثِ رشک بنے گا۔ اور یہ خزاں دیدہ درخت ایک بار پھر بہار کی فضاؤں میں گُل بداماں لہلہاتا نظر آئے گا۔ اور اس سوکھے ہوئے چشمے کی لہریں ایک مرتبہ پھر اکبرالہ آبادی کے آب دور کو دعوتِ مقابلہ دیتی نظر آئیں گی لیکن یہ اُسی وقت ہو سکتا ہے کہ ہم ماضی پر نگاہ رکھیں اور مستقبل کو اُس کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کریں۔ ایک مرتبہ پھر دوسروں کے دستِ کرم کے بجائے اپنے دم و قدم کو دیکھیں اور ہم میں سے ہر ایک اپنی ذاتی (میں) کو خاندانی میں مدغم کر دے لیکن اگر آپ ایسا نہ کر سکے۔ اگر اب بھی دوسروں کی چمک دمک آپ کی نگاہوں کو خیرہ کرتی رہی اگر اب بھی آپ سکندری و دارائی کو فقر جنید و بسطامی پر ترجیح دیتے رہے اگر اب بھی آپ کی نگاہ میں دوسروں کی دیباو حریر کی چادریں آپ کے گلیم کہنہ پر فوقیت رکھتی رہیں اگر اب بھی آپ کے خاندان کی عزت وعظمت کو آپ کے ذریعہ خریدا جا سکتا رہا۔ تو الوداع اے خاندانِ حسین پور الوداع الفراق اے عزت خاندانِ الفراق۔ حضرات ان تمام کے باوجود جن اصحاب کو دور بینی اور ہوش مندی نے خاندان اور اُسکی عزت کو رخصت کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے انھیں چاہئے کہ وہ برائے خدا خاندان کی دوسو سال پُرانی تاریخ کو کسی نگاہِ کرم پر بھینٹ چڑھانے اور اپنے بزرگوں کی عزت کی تجارت کرنے کے بجائے اس خاندان سے رشتہ توڑ کر اور اس سے منسوب ہوئے بغیر اس طرح دوسروں کا جز بنیں کہ کسی کو یہ سُننے کا موقع نہ ملے کہ آپ فلاں خاندان کے چشم و چراغ ہیں اور فلاں بزرگ کے نام لیوا۔ اس صورت میں کم از کم اُن کے بزرگوں کی عزت محفوظ و سلامت رہ سکے گی ورنہ آج کل ہمارے پرانے الہ دینی چراغ کو ایک نئے چراغ اور جامِ جم کو ایک جامِ سفال کے بدلے میں خریدنے کے لئے ہمارے بہت سے اعزا اور اقربا اپنی محبت و اُلفت کی داستانیں سنا رہے ہیں۔

کسے علم تر اازمن نیا سوخت کہ مرا نشانہ نکرد۔

حضرات! اگر آپ اب بھی اپنی وقت کی دستبرد سے بچی ہوئی پونجی کو عزیز رکھتے ہیں۔ اگر آپ اب بھی اپنی رفت کی دستبرد سے بچی ہوئی پونجی کو عزیز رکھتے ہیں اگر آپ اب بھی خاندانی عزت وعظمت کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو ضرورت ہے کہ ہم اُس کے گرد ایک آہنی دیوار بن جائیں کہ تخریبی قوتیں اُن تک بار نہ پا سکیں۔ ضرورت ہے کہ ہم سنگین چٹان کی شکل اختیار کر لیں کہ مخالف لہریں اُس سے ٹکرا کر پیچھے لوٹنے پر مجبور ہو جائیں۔ ضرورت ہے کہ ہم من و تو۔ زردار اور نادار۔ بلند و پست کے فرق کو ہٹا کر اس طرح شیر و شکر ہو جائیں کہ برادرانِ یوسف کی ریشہ دوانیاں ہمارے اتحاد و اتفاق کو متزلزل نہ کر سکیں۔ حضرات۔ شاید غیر مناسب خودستائی ہوگی اگر میں اس سلسلہ میں اس ایسوسی ایشن کی خدمات کا ذکر کروں۔ مگر مَیں سمجھتا ہوں کہ اُن کے حقیر ہونے کے باوجود اُن کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ اُس وقت وجود میں آئی جبکہ یہ خاندان اپنی شخصیت اور اجتماعیت کو بہت تیزی سے کھو رہا تھا۔ اس نے بر وقت اُس گرتی ہوئی عمارت کو تھاما۔ ہمیں افسوس ہے کہ اس سلسلہ میں ہماری تجویز کردہ چالیس سالہ شرطِ ممبری نے ہماری تمام وضاحتوں اور نیک ارادوں کے باوجود ہمیں خاندان کے ایک حصہ کے اشتراک وتعاون سے محروم کر دیا۔ گو ہم نے گذشتہ سالوں میں ایک سے زیادہ مرتبہ اس شرط کو توڑنے کی کوشش کی، اگرچہ حالات کے سازگار نہ ہونے کی وجہ سے ہم کامیاب نہ ہو سکے۔ بہر حال میں سمجھتا ہوں کہ اگر ہمیں اپنا خاندان اور اُس کا وقار عزیز ہے تو ہمیں سب کو بلا استثنا مضٰی ما مضٰی کہہ کر اپنی قوتوں کو یکجا مجتمع کر لینا چاہئے۔ تاکہ ہم نہ صرف خاندان کی عظمتِ گزشتہ کو واپس لا سکیں، بلکہ اپنے خاندان کے علمی، مالی، اخلاقی، اقتصادی معیار کو بھی بلند سے بلند تر کر سکیں۔ لیکن اگر ہم میں سے کچھ ماضی کے ناگوار اور اس لئے قابلِ افسوس واقعات کی تلخی کو دور نہ کر سکے، تو ممکن ہے کہ وہ ذاتی طور پر کسی حد تک حق بجانب ہوں۔ لیکن وہ خاندانی حیثیت سے ایک ایسی فاش غلطی کے مرتکب ہوں گے۔ جسے

شہرِ بہاولپور کی تاریخ کا مختصر جائزہ

بہاولپور کا قیام اور آبادکاری

اس دنیا میں روزِ اول سے کیا کیا تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ کیسے کیسے ذی وقار اقتدار میں آئے اور خالی ہاتھ اس جہاں سے چلے گئے۔ روئے زمین پر جہاں جہاں خاک اُڑتی تھی وہاں آبادیاں بن گئیں۔ جہاں آبادیاں تھیں گل وبُلبل نغمہ سرا تھے وہ ویران دشت بن گئے۔ یہی سب قدرت کی نیرنگیاں کہلاتی ہیں۔ یہ بہت قرنوں کی بات نہیں ہے صرف ڈھائی سو سال پہلے کہ بات ہے جہاں آج شہر بہاولپور جگ مگ کر رہا ہے وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ صرف ایک چھوٹی سی بستی تھی جس کا نام سوڈیا کی جھوک تھا۔

امیر بہاول خان اول کی جاگیر اٹھارویں صدی کے درمیان میں جنوب میں کوٹ سبزل احمد پور ملّہ تحصیل صادق آباد سے لے کر شہر فرید، جو موجودہ چشتیاں کے نام سے جانا جاتا ہے، تک پھیلی ہوئی تھیں۔ امیر بہاول خان کو اپنی جائیداد کے نظام کو سنبھالنے کے لئے اپنی جاگیر کے وسط میں ایسی جگہ مطلوب تھی جسے وہ مرکز بنا سکے۔ اُس زمانے میں باضابطہ وزیر یا سفیر نہیں ہُوا کرتے تھے۔ چند علاقے کے بڑے سردار صلاح مشورے دے دیتے تھے۔ اُس زمانے میں کہرانی، جھورانی، عربانی، گھمرانی، پرجانی مشہور شخصیات تھیں جو کہ علاقے پر اپنا اثر ورسوخ رکھتے تھے۔ امیر بہاول خان نے ان سب کو طلب کیا اور مشورہ کرنے کے بعد اپنے دارالخلافے کے لئے سوڈیا کی جھوک کا انتخاب کیا۔ امیر بہاول خان کے نام پر بہاولپور کی بنیاد رکھ دی گئی۔ اور 1748ء بمطابق 1162ھ میں شہر بہاولپور کی آبادکاری کا کام شروع ہوگیا۔ ابتداء میں بازار بنوائے گئے اور وہ اس طرح کہ دونوں جانب دُکانوں کی محرابیں تھیں اور لوگوں سے کہہ دیا گیا کہ جس کو جو جگہ پسند آئے وہ اُسی کی ہے۔ یہی نہیں بلکہ مکانات کی تعمیر کے لئے مفت زمینیں بھی فراہم کی

حضور پاک ﷺ کے ایک چچا حضرت عباسؓ تھے۔ آپ کے دس بیٹے اور تین بیٹیاں تھیں۔ ان میں سے ایک بیٹے حضرت عبداللہ بن عباس کی چھٹی پشت میں عباسی خاندان کا مشہور علم دوست خلیفہ ہارون الرشید گذرا ہے جو 786ء سے 809ء تک حکومت کرتا رہا۔ یہ مسلمانوں کا زمانہ ترقی تھا اور یورپ سو رہا تھا۔ 790ء میں ہارون الرشید نے پیدل حج کیا۔ مکّہ میں لوگ پانی کو ترس رہے تھے۔ ہارون الرشید کی بیوی زبیدہ نے نہر کھدوائی جو آج بھی نہر زبیدہ کے نام سے مشہور ہے۔ 176ھ سے 665ھ تک تقریباً پونے پانچ سو سال عباسی حکومت کا دور دورہ رہا۔ جہاں اس دور میں متقی، پرہیز گار رعایا پرور حکمران آئے وہاں کچھ سفاک عیش کوش اور بلا نوش بھی آئے۔ آخر دور میں انحطاط کا زمانہ آ گیا۔ محلاتی سازشیں اور خانہ جنگی عروج پر پہنچ گئی۔ دستورِ زمانہ کے تحت تاتاریوں نے بغداد پر حملہ کر دیا اور قتلِ عام شروع ہو گیا۔ آخری عباسی شہزادے ابوالقاسم بن ابونصر نے بھاگ کر مصر میں پناہ لی مگر تاتاریوں سے مڈبھیڑ میں کام آ گیا۔ اُس زمانے میں جہاں آج پاکستان ہے اس علاقے میں محمد تغلق بن غیاث الدین تغلق کی حکومت تھی۔ وہ عباسیہ خاندان کا دلدادہ تھا۔ مصر لاتعداد تحائف بھجوائے۔ جمعہ اور عید کے خطبات میں مصر کے خلیفہ کا نام شامل کرایا۔ عباسی خاندان نے جب تغلق کی محبت کا یہ عالم دیکھا تو فوراً برصغیر آنے لگے۔ اور تغلق نے بڑی بڑی جاگیروں سے نوازا۔ کچھ عباسی خاندان کے لوگ بلوچستان کے علاقے میں آباد ہو گئے اور کچھ نے سندھ کا رُخ کیا۔ عباسی خاندان نے اپنا عروج مذہبی قیادت سنبھال کر کیا۔ اور پھر ان کی اولادیں زمیندار، جاگیردار بن گئیں اور بالائی سندھ کی افراتفری سے فائدہ اُٹھا کر یہ لوگ سندھ کے حکمران بن بیٹھے۔ اس زمانے میں بہاولپور سندھ میں شامل تھا۔

سندھ کے راجہ دھورنگ نے اپنی بیٹی کی شادی امیر سلطان سے کر دی جن سے ایک بیٹے نے جنم لیا جس کا نام امیر ابن رکھا گیا۔ بعد ازاں امیر ابن کی شادی راجہ دھورنگ کے بیٹے راجہ جھکڑ کی بیٹی سے ہوئی۔ ایک لڑکے نے جنم لیا جس کا نام مہر خان رکھا گیا۔ اسی مہر خان کے پڑپوتے بہاول خان تھے۔ اصل نام تو بہاالله خان تھا۔ مگر پیار سے بہاول مشہور ہوئے۔ اسی دور میں عباسی خاندان کی اچھی خاصی جاگیر بنی جس

ہزاروں سال قبل یہاں بہتا تھا۔ اور اب لوک کہانیوں میں اس کا ذکر ہے۔ بعض مورخین نے یہ بھی کہا کہ دریائے باکڑہ دراصل دریائے سندھ کی ہی قدیم گذرگاہ ہے۔

چولستان یا مسحور کن سراب:

آج سے لاکھوں ہزاروں نہیں صرف سینکڑوں سال قبل ہی بہاولپور کی سرزمین پر صحرا کی وسعت ایسی نہ تھی جیسی کہ آج ہے۔ تاحدِ نگاہ ریت کے تودے اور ڈھیر ہی ڈھیر پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ سب علاقے کسی زمانے میں لہلہاتے کھیت اور مسکراتے مرغزاروں سے شاداب تھے۔ یہاں سے وادی سندھ کا ایک دریا گذرتا تھا جو اُس وقت دریائے باکڑہ کے نام سے مشہور تھا جو ریاست بہاولپور کو سیراب کرتا تھا۔

صحرائے چولستان دراصل صحرائے تھر و راجپوتانہ کا ہی ایک حصّہ ہے۔ پانچ ہزار قبلِ مسیح میں چولستان کا وجود نہیں تھا۔ مگر اب مشرقی اور جنوبی صحراؤں نے اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے اور اندازاً یہ چولستان اب دس ہزار تین سو ننانوے مربع میل پر پھیلا ہوا ہے۔ سابقہ ریاست بہاولپور کے تین اضلاع یعنی بہاولنگر، بہاولپور اور رحیم یار خان کے تقریباً دو تہائی حصّے پر یہ چولستان ہے۔ یہ واضح حقیقت ہے کہ چولستان میں دریائے باکڑہ جیسلمیر میں گھارا یا گھاگرا اور آج سے ہزاروں سال قبل دریائے سرسوتی کہتے تھے۔ سرسوتی دراصل ہندوؤں کی ایک دیوی کا نام ہے جو انتہائی متبرک سمجھی جاتی ہے۔

چولستان کے متعلق کئی ماہرینِ آثارِ قدیمہ نے اپنی رائے اور رپورٹ پیش کی لیکن سب سے مستند پاکستان کے ماہر آثارِ قدیمہ ڈاکٹر مغل نے کہا کہ چولستان کا عہد ہڑپائی عہد سے بھی قدیم ہے۔ یہ قدیم آثار بہاولنگر اور بہاولپور کے اضلاع میں کم اونچے ٹیلوں کی شکل میں پائے جاتے ہیں۔ انہیں علمی اصطلاح میں باکڑہ دور کہا جاتا ہے۔ یہ آثار پانچ ہزار سے چھ ہزار قبل کے میدانی عرصے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان علاقوں کے پائے جانے والے برتن اور ان کے ٹکڑے بالکل جُدا نوعیت کے ہیں۔ اکثر برتن سُرخ رنگ کے پائے جاتے ہیں۔ اور بعض برتن ایسے ہیں جو سندھ سے ملنے والی کسی بھی قدیمی تہذیب سے مطابقت نہیں رکھتے۔ یہاں سے پتھر کے چاقو، سوراخ کرنے والے برمے، تیروں کے پھل اور کُھرچنے کے

تھا۔ اس کے بڑے بیٹے تنو نے اپنے بیٹے ''بجے راؤ'' کے نام پر ایک قلعہ تعمیر کیا جس کا نام قلعہ بجنوٹ رکھا۔ جواب بھی بہاولپور کی سرزمین پر موجود ہے۔ راؤ کے ولی عہد دیوراج نے ایک قلعہ تعمیر کیا۔ اس کا نام دیوراول رکھا۔ جو رفتہ رفتہ دیوارڈر بنا اور پھر دراوڑ پڑ گیا۔ قلعہ دراوڑ تک جانے کے تین راستے ہیں۔ آسان راستے شاہی والا ہو کر قلعہ دراوڑ پہنچتے ہیں۔ قلعہ دراوڑ میں ایک بلند و بالا مسجد واقع ہے۔ اسے نواب بہاول خان (سوم) نے 1875ء میں تعمیر کرایا تھا۔ یہ مسجد کیا ہے فنِ تعمیر کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ اس قلعے کے متصل ایک شاہی قبرستان ہے۔ یہ قبرستان پاکستان میں واحد نوعیت کا ہے۔ محمد بہاول خان (اول) اور ان کے بھائی مبارک خان تو بہاولپور میں ملوک شاہ کے قبرستان میں مدفون ہیں جبکہ تمام حکمران ریاست بہاولپور اس گورستان دراوڑ میں ایک سجے سجائے آرائش شدہ وسیع ہال میں مدفون ہیں۔ یہ ہال اکیس فُٹ چوڑا اور ایک سو فُٹ لمبا ہے۔ اس قلعہ کے قریب ہی اسلام کے عظیم مبلغین یعنی صحابہ کرام اجمعین کے مزارات بھی ہیں۔

قلعہ پھلڑہ

یہ قدیم قلعہ ہے جسے بیکانیر کے راجہ نے 1166ھ، 1751ء میں تعمیر کرایا تھا۔ اس کی دیواریں پکی اینٹوں کی بنی ہوئی ہیں۔ اور دیواروں کے درمیان کے حصے میں مٹی بھری ہوئی ہے۔ اس کے مغرب میں ایک کنواں ہے جو 118 فٹ گہرا اور چار فٹ قطر میں ہے۔ قلع کے اوپر تین توپیں رکھی ہیں اور قلعہ دار نہایت رعب اور دبدبے سے رہتا تھا۔

قلعہ مروٹ

یہ قلعہ انتہائی قدیم ہے۔ یہ قلعہ چتوڑ کے مہروٹ نے تعمیر کرایا تھا۔ یہ قلعہ جام سوہرا کے قبضے میں رہ چُکا ہے۔ اور اس نے 1491ء میں اس کی مرمت کرائی تھی۔ اس قلعے میں خوبصورت مسجد ہے جو مسجد شاہِ مرواہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس قلعے کی خاص بات یہ ہے کہ یہاں راجہ بیکانیر کی پیدائش ہوئی۔

اُن کے آثار طرزِ تعمیر اور نقشے کا پتہ دیتے ہیں۔

چولستان کے خودرو جھاڑیاں اور پودے:

دوسرے صحراؤں کی نسبت چولستان کی انفرادیت کی دو وجوہات ہیں۔ اول اس کی ظاہری حالت کہ یہ صحرا فطری حُسن سے مالا مال ہے۔ دوسرے سارا سال ریت کے ٹیلوں پر خودرو پودے اُگتے ہیں۔ ان میں کچھ جڑی بوٹیاں نایاب ہیں اور ادویات میں استعمال ہوتی ہیں۔ اِن میں کڑوی بوٹی یا کرڈنڈی جگر کی گرمی اور صفرا کے علاوہ گرمی کے موسم میں پلائی جاتی ہے۔ چھیری بوٹی جوڑوں کے درد، گٹھیا، پیشاب اور مثانے کی سوزش کے لئے اکسیر ہے۔ اِن کے علاوہ کرن بوٹی دمہ کے مرض لے لئے، پھٹوکڑ بوٹی پیشاب کی جلن، جنڈ بوٹی آنکھوں کی جلن اور سوجن، لاوَنی بوٹی سر درد، دردِ شقیقہ، گندی بوٹی نزلہ زکام اور جوشاندے کا اہم جزو ہے۔ اِن کے علاوہ اور نباتات مثلاً کھار کپڑے دھونے کے لئے آٹو نک بطور ترکاری سالن پکاتے ہیں۔ اس سے سجّی بناتے ہیں اور کرین کا اچار بنایا جاتا ہے۔

شکارگاہیں:

چولستان ہرنوں، تیتر، بٹیر، چکور، مُرغابی کے شکار کے لئے مشہور ہے۔ کسی زمانے میں یہاں ہرن بکثرت پائے جاتے تھے۔ اب شکاریوں کی مہربانیوں سے پاڑ انسل ناپید ہو چکی ہے۔ عام ہرنوں کی ڈاریں تو اب بھی نظر آتی ہیں۔ پچاس برس پہلے یہاں نواب، راجے، مہاراجے، گورنر جنرل شکار کھیلنے آتے تھے۔ اب بھی صاحبِ اقتدار آتے ہیں اور عقاب، شکروں اور باز وغیرہ کا شکار کرتے ہیں۔

ملبوسات:

یہاں کے مرد عموماً لمبے کُرتے پہنتے ہیں اور لُنگی باندھتے ہیں۔ سر پر پگڑی یا پٹکہ باندھتے ہیں۔ عورتیں زیادہ تر چھینٹ یا پھولدار یا سادے گھگھر ے پہنتی ہیں جو تقریباً 20 سے 25 گز کا ہوتا ہے۔ اوپر چولی

کے بعد اس میں کمی آ گئی۔ مرمت وغیرہ ہوتی رہتی تھی۔ مگر 1966 میں اس کے والی جب اس جہاں سے گذر گئے تو نور محل کا کوئی وارث نہ رہا۔ بَس اس کا اللہ ہی وارث ہے۔

سنٹرل لائبریری، بہاولپور:

جب فرمانروائے ریاست بہاولپور صادق محمد خان 1924 میں تخت نشین ہوا تو یہ نوجوان بہت زیرک انسان تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اس کی تاج پوشی کی رسم کے روز ایک پبلک لائبریری کی بنیاد رکھی جائے اور ریاست بہاولپور کے امراء و وزراء اور دیگر مخیّر حضرات اس کے لئے چندہ فراہم کریں۔ وہیں چندہ اکھٹا ہُوا اور یہ رقم ایک لاکھ کی خطیر رقم ہوگئی۔

جہاں آج سنٹرل لائبریری ہے یہ قطعہ اراضی اٹھاسی کنال اور تیرہ مرلہ پر مشتمل ہے جو نواب صاحب نے خود عطیہ کیا۔ نواب صاحب نے اپنے ہاتھ سے سنگِ بنیاد رکھا۔ لائبریری کی تعمیر کا کام 1924 میں ہی شروع ہوگیا۔ ڈیڑھ برس تک کام ہوتا رہا۔ جمع شُدہ رقم اس کام کے لئے ناکافی تھی۔ دس سال کام بند رہا۔ بعد ازاں فیصلہ کیا کہ لائبریری کو بلدیہ بہاولپور کے سپرد کر دیا جائے۔ بلدیہ بہاولپور نے ٹھیکیداروں کے اخراجات ادا کئے اور لائبریری پر قبضہ کر لیا۔ جب مشتاق احمد گورمانی ریاست کے وزیراعظم بنے تو ایک فیصلے کے مطابق صادق ایڈنگ لائبریری کا نام بدل کر سنٹرل لائبریری رکھ دیا گیا۔ 23 مارچ 1949 کو پاکستان کے پہلے وزیراعظم لیاقت علی خان بہاولپور تشریف لائے۔ جلسہ سنٹرل لائبریری کے وسیع و عریض سبزہ زار میں منعقد ہوا۔ 1952 میں جب کتابوں کا ذخیرہ اس حد تک بڑھ گیا تو بالائی منزل بھی ناکافی ہوگئی۔ لہٰذا حکام سے گذارش کی گئی اور لائبریری کی توسیع کا کام ہُوا۔ چوہدری اشرف صاحب جو لائبریرین تھے اُنہوں نے لائبریری میں مندرجہ ذیل شعبہ جات کا اضافہ کیا:

سنٹرل لائبریری شعبہ خاص، شعبہ اطفال، شعبہ سفری، شعبہ دستاویز فلم، غیر ملکی زبانوں کا تدریسی شعبہ، مائیکرو فلم کا شعبہ، شعبہ خواتین، اخبارات و رسائل کا شعبہ، سمعی و بصری شعبہ، شعبہ جلد سازی۔

اُس وقت لائبریری میں کل چھیاسی ہزار کتابیں موجود تھیں۔ آج انٹرنیٹ سے معلومات کے مطابق

گئی۔ 1945 میں پیرزادہ عبدالرشید پرنسپل مقرر ہوئے۔ بعد ازاں پروفیسر ای۔سی۔ڈکسن پرنسپل بنے۔ پروفیسر اقبال صدیقی، پروفیسر حافظ عبدالحق، پروفیسر عبدالمجید، پروفیسر عبدالمحصی، پروفیسر ساجد، پروفیسر دلشاد کلانچوی اور پروفیسر حبیب اللہ یہ سب اپنے مضامین کے ماہر تھے۔

بہاولپور کی اہم مساجد:

بہاولپور کی مساجد طرزِ تعمیر اور خوبصورتی میں اپنا جواب نہیں رکھتی ہیں۔ خاص طور پر جامع مسجد الصادق، جامع مسجد مچھلی بازار، مسجد فردوس، مسجد نور محل، مسجد ملوک شاہ، چشتیاں کی دو مساجد، مسجد بھونگ، جامع مسجد احمد پور شرقیہ، مسجد حاجات، اوچ شریف، جامع مسجد قلعہ دراوڑ، جامع مسجد فورٹ مروٹ، بہت مشہور ہیں اور دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ بعد ازاں جامع مسجد مچھلی بازار جو آج کل مچھلی ہٹہ کے نام سے مشہور ہے۔ اسی مسجد میں حافظ ضیاء احمد مشتاق جو ضیاء حسین پوری کے نام سے معروف ہوئے حفظِ قرآن کی سعادت اسی مسجد میں اُن کے حصے میں آئی۔

اوچ شریف کی اہمیت:

اوچ کا معروف و قابلِ احترام خطہ قدیم ایام سے ملتان کی حکومت کے ماتحت رہا ہے۔ یہ علاقہ اُن چھ مقامات میں سے ایک ہے جن کے قلعوں کو ساہسی بن سہیرس نے محصول کے عوض مٹی سے بھرنے کا حکم دیا تھا۔ اوچ شریف کی وجہ تسمیہ یہی ہے کہ اس کی زمین اونچی ہے۔ اور خُدا رسیدہ بندوں کا مدفن ہے۔ اس کے معروف بزرگ یہ تھے:

عبدالحمید بن جعفرؒ، مخدوم شیخ عبدالقادرؒ، شیخ زین العابدینؒ، شیخ حمٰن قادری، سید گنج بخش، حضرت مخدوم جہانیاںؒ، شیخ برہان الدینؒ، سلطان محمود ناصر الدینؒ، سید منقی اللہ ولد سلطان محمد، سید اسماعیل ولد سید فیض اللہؒ، سید راجو ولد سید اسماعیلؒ، سید محمد مرادو، سید واریہؒ، سید جلالؒ، سید نو بہار شاہؒ، سید راجو قتالؒ، سید علی اکبرؒ، سید عیسیٰ عبدالوہابؒ، سید چراغ شاہؒ، شیخ ضیائیؒ، شیخ فضل اللہؒ، شیخ اسماعیل حالیؒ، شیخ شجاع بخاریؒ، سید نصیر القادریؒ، شیخ جمالؒ، شیخ محمد بن بایزیداور علیؒ، شیخ عبدالوسیعؒ۔

ہیں۔

بہاولپور کے اولیاء، اصفیاء اور روحانی فرمانروا:

بہاولپور کا خطہ ابتداء ہی سے مذہبی اور روحانی بزرگوں کی عقیدت مندانہ جذبات سے سرشار رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں کے سلاطین اور رعایا دونوں نے ہی ہمیشہ اولیاء اور اصفیاء کے وجود کو اسباب دین و دنیا جان کر سُرمۂ بصیرت بنائے رکھا۔ ان بزرگانِ دین میں امام المتقین حضرت جلال الدین بخاریؒ، حضرت جلال الدین حسین مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ، سلطان العارفینؒ، حضرت سید غوث محمد جیلیؒ، حضرت مخدوم حمید الدین حاکمؒ، حضرت تاج الدین سرور چشتیؒ، حضرت قبلہ عالم نور محمد مہارویؒ، حضرت خواجہ محکم الدین شہید سیرانیؒ، حضرت لال سوہانراؒ، حضرت چنن پیرؒ، حضرت سید شاہ ملوک قادری کھیتلیؒ، حضرت خواجہ پیر عبدالخالق اویسیؒ، حضرت شیخ المساکین موسیٰ نوابؒ، حضرت خواجہ خُدا بخش خیر پوریؒ شامل ہیں اور لاکھوں زائرین حاضری دیتے ہیں۔